ISSN 0974-7346

مارچ ۲۰۲۶ء

جلد۲۱۳ــــعدد ۳

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051
آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ ماہ رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۲۶ء عدد ۳

مجلس ادارت

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر:۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۴
مقالات		
سید سلیمان ندوی کی کتاب تاریخ ارض القرآن کا مطالعہ	ڈاکٹر محمد ذہیب حنیف	۷
امن وہم آہنگی میں اکبر کی خدمات: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اسامہ، ڈاکٹر نجم السحر	۲۱
عربی ناول نگاری میں سیرت النبی ﷺ کا ارتقاء	کفیل احمد بٹ، پروفیسر ارشاد احمد میر	۴۵
مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ کے تعلقات: "غبار خاطر" کے آئینے میں	ادیبہ صدیقی	۵۱
جواہر لال نہرو اور مسلم اقلیت	بھاؤک شرما	۶۱
تبصرۂ کتب	ع۔ص، ک۔ص اصلاحی، ف۔اصلاحی	۶۸
ادبیات		
نعت	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۷۸
غزل	جمیل مانویؔ	۷۹
معارف کی ڈاک	ٹی-آر-رینا	۸۰
رسید کتب موصولہ		۸۲

شذرات

جمہوریت کی زندگی کی ایک دلیل اور پہچان، انتخابات کا عمل ہے۔ ملک و قوم کے لیے زیادہ مفید، کارآمد اور بہتر دماغوں اور کارگزار انسانوں کے لیے ترجیحی پسند کا اظہار ہی انتخابات کو بامقصد اور نتیجہ خیز بناتا ہے۔ ہندوستان نے دور غلامی میں بھی اس عمل کو دیکھا اور برتا اور غیر ملکی حکومت کی موجودگی اور اس کے حاکمانہ اثرات کے باوجود بعض مسائل پر اپنے حق انتخاب کا کسی درجہ آزادانہ استعمال بھی کیا اور دو یا اس سے زیادہ کے درمیان زیادہ بہتر اور حالات کے لحاظ سے موزوں تر نمائندوں کے ناموں پر صاد کرنے میں عقل و شعور کو ترجیح بھی دی، گو جذبات کا کسی درجے میں اثر رہا تاہم یہ نفرت، غیظ و غضب اور تعداد کے جبر اور طاقت کے بے محابا اظہار سے بڑی حد تک دور ہی رہا۔ لیکن آزادی کے بعد دوراندیشی اور ملک و قوم کے لیے خیر طلبی کے صفات اور مثبت افکار و نظریات، رفتہ رفتہ منفی جذبات اور نہایت محدود مفادات کے اسیر ہوتے گئے۔ اس تغیر کا اندازہ ان کو عام طور سے ہوا جن کی انگلیاں، جمہوریت کی نبض پر تھیں۔ لیکن ان کے حاشیۂ خیال میں غالباً یہ نہیں آیا ہو گا کہ جمہوریت اس قدر تیزی سے اس آمریت کی خبر دینے لگے گی، جہاں مطلق العنان بادشاہوں کی سلطنتیں بھی ظلم و جبر و استبداد کے باب میں شرمسار نظر آنے لگتی ہیں۔ جو انتخابات عوامی پسند اور ناپسند کے مظہر تھے وہ قدیم قبائلی خانہ جنگیوں، سفاکیوں اور خون آشامیوں کی نئی تصویر میں کیسے بدلتے جاتے ہیں۔ وقت نے اس احساس کی شدت میں بہت جلد اضافہ کر دیا۔

***

ملک کے مسائل اور مشکلات پر نظر رکھنے والے اصحاب فکر و قلم کی تحریروں اور تاثرات سے یہ اندیشہ قوی ہوتا جاتا ہے کہ جمہوریت کا مستقبل کہیں اندھیروں میں گم نہ ہو جائے۔ خاص طور پر انتخابات میں فتح کے حصول کے لیے جس طرح برسر اقتدار جماعتوں اور افراد نے جمہوری ضوابط و اخلاق کو بالائے طاق رکھنے کو اپنی عادت میں بدل ڈالا ہے، وہ حد درجہ باعث فکر و تشویش ان کے لیے ہے جو تعددیت کی زد میں آکر اکثریت اور اقلیت کے خانوں میں محصور کر دیے گئے ہیں۔ یہ جمہوریت کی بدقسمتی ہے کہ آئین و قوانین کے پاسداروں میں آئین کی بے حرمتی اور قانون کی پامالی کے لیے مسابقت کا ماحول سا ہو گیا ہے۔ نفرت کا جو لاوا، حالات نے پوشیدہ کر رکھا تھا اب اس کی آتش فشانی کا عالم ہی کچھ اور ہے۔ برسر اقتدار جماعت کے ایک وزیر اعلیٰ کے

فرائض منصبی گویا اب صرف اسی اظہار نفرت کے لیے رہ گئے ہیں کہ ہر صبح وہ یہ اعلان کریں کہ "میں اسلام کو ڈھادوں گا، مسلمانوں کو ہر طرح سے پریشان کروں گا"، مسلمانوں کی پریشانی ہی میں ان وزیر موصوف کے لیے سامان راحت ہے۔ جمہوریت کے انتخابی عمل کو بے اثر کیسے کیا جائے اور جمہوریت کے جسم و جاں پر وار کیسے کیا جائے، فکر ہے تو اسی کی۔ مسلمان اقلیت کی حیثیت سے جمہوری حقوق کے ذریعہ اثر انداز نہ ہو سکیں اس کے لیے منظم طریقے سے ان کو اپنے ہی وطن میں اجنبی قرار دیے جانے کا عمل جس شدت و مہارت سے جاری ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ جمہوریت کی بے بسی اب اس درجہ کو پہنچ گئی کہ رائے دہندگان کی فہرست سے نام خارج کرنے کی فنکارانہ تدبیریں اور جن حلقوں میں تعداد کی اثر اندازی کا اندیشہ ہوا ان کی از سر نو حلقہ بندی کی سازشیں کھل کر اور آئینی اداروں کی چشم پوشی کے ساتھ روزافزوں ہیں، ان سے صرف کمزور طبقات ہی نہیں، راسخ جمہوریت کی زندگی کا سوال درپیش ہے۔

***

مسلمانوں کے ساتھ نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبوں کے زیر اثر رونما ہونے والے واقعات کی کچھ جھلکیاں ہم مسلسل پیش کرتے آئے ہیں۔ یہ محض زخموں کی نمائش نہیں، جب ایسے معاملات روزمرہ کے زمرہ میں آجائیں تو وقت کے لامحدود دفتر میں ان کا اندراج ضروری ہو جاتا ہے کہ زمانہ کی گردش کبھی یہ شکوہ نہ کرے کہ داغ حسرت دل کا شمار کون کرے اور ظلم و جبروت کے گناہوں کا حساب کیسے کیا جائے۔ تاریخ کے سب سے پاکیزہ اور اعتماد و اعتبار کے قابل صحیفوں اور دستاویزوں میں وقت کے آمروں اور جابروں کا ذکر، محض قصوں اور فسانوں کے فن کی بقا کے لیے کیوں کیا جاتا؟ مقصد ہمیشہ واضح رہا کہ انسانی معاشروں میں فساد کی سب سے بڑی وجہ کچھ لوگوں کی وہ ذہنی افتاد رہی جو غرور، خود پسندی اور طاقت کی بدمستی کے ذریعہ عدل و انصاف اور حقوق میں مساوات کی پامالی کا سبب بنتی رہی۔ جھوٹ اور فریب جیسی مہلک ترین سماجی بیماریوں میں مبتلا ہو کر انہوں نے اقلیت ہی نہیں اپنی اکثریت کو بھی عذابوں کا شکار بنادیا۔ طاقتور ترین قومیں اپنے ناعاقبت اندیش حکمرانوں کے ذریعہ تاریخ کے صفحات میں عبرت کا عنوان و نشان بن گئیں، تاریخ کے مستند ترین صحیفوں نے ایسی قوموں کا ذکر بار بار کیا اور ان کی بربادی کے اسباب بھی بڑی وضاحت سے بیان کر دیے۔ واذا بطشتم بطشتم جبارین جیسے اسباب بیان کرنے میں، آنے والے انسانی معاشروں کے لیے بتایا گیا کہ سامان عبرت اور عروج و زوال کی یہ داستانیں، عقل و شعور کی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے سب سے موثر علامتیں اور اشارے ہیں، کوئی مانے یا نہ مانے۔ ان فی

ذلک لآیۃ وماکان اکثرھم مؤمنین۔ انجام وہی ہو کر رہتا ہے جس پر نہ آسمان روتا ہے نہ زمین۔

***

ملک عزیز کا اب ہر دن بلکہ ہر لمحہ جس طرح اس ملک کی بقاوارتقاء کے تعلق سے کچھ کہتا نظر آتا ہے ایسے میں ان کی یادوں کا زندہ ہونا یا زندہ کیا جانا، وقت کے تقاضوں میں شامل کرنے کو بجا طور پر جائز ٹھہراتا ہے، جنہوں نے اپنی قوم اور ملک کے لیے خودداری، خوداعتمادی کے ساتھ سیاست اور امور حکمرانی میں روایتی شرافت اور ظرف کی وسعت اور افکار وخیالات کے اظہار میں لفظوں اور جذبوں کی حرمت کا لحاظ رکھا۔ چند دنوں پہلے بعض اردو اخباروں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یادوں کی شمع روشن کی۔ فروری کے مہینے میں مولانا آزاد، قفس عنصری سے بھی آزاد ہوئے تھے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ مولانا آزاد کو پھر سے تلاش کیا جائے، علم و فضل اور حکمت و فراست، عزم اور حوصلہ، ہمت و جرأت اور ایثار و قربانی اور سب سے بڑھ کر معاملہ فہمی اور عاقبت بینی کی ان کی خوبیوں کا مطالعہ ان کی عبقری شخصیت کے پس منظر میں کیا جانا، شاید وقت کا بھی وہ تقاضا ہو جس کے نتیجے میں ملت کی موجودہ سب سے بڑی ضرورت پوری ہو سکے۔ وہی ضرورت جس کے لیے عرصے سے زبان پر یہ حرف کاش جاری ہے کہ:

ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لیے

مولانا کو یاد کرنے کا معارف اور دارالمصنّفین کا حق بھی اس لیے زیادہ ہے کہ یہ ادارہ ہمیشہ ان کی خصوصی توجہات کا مرکز رہا۔ معارف کے تعلق سے ان کا یہ جملہ تو زبان زد ہے کہ صرف یہی تو ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ ان کا یہ جملہ بھی دارالمصنفین کے ذمہ داروں کی سماعت میں محفوظ رہ گیا کہ دارالمصنفین کا دائرہ جس قدر تنگ رکھیں گے اسی قدر وہ حقیقی اور عملی ہو گا۔ دو چار آدمی اچھے کام کر سکتے ہیں، مجمع جھلا بیکار ہے۔

دارالمصنفین سے مولانا کے تعلق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن موجودہ ملی و ملکی حالات میں اپنے قابل فخر ماضی کی یادوں سے تسکین دل وجاں کے لیے سامان فراہم کرنے کی خواہش فطری ہے کہ درد و درماں کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ صاحب معارف سے باتیں کرتے ہوئے مولانا آزاد نے بہت پہلے کہا تھا کہ موجودہ فتنہ سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے، پہلے فتنۂ استبداد تھا، اب فتنۂ حریت ہے، علم، اخلاق، مذہب، تقویٰ، طہارت نفس کوئی شے بھی زمانے کو مطلوب نہیں، صرف چند الفاظ مجہولہ کی ضرورت ہے جو شخص ان لفظوں کو بلند آہنگی سے بول دے وہ امام العصر ہے:

حق مغفرت کرے

***

سید سلیمان ندوی کی کتاب تاریخِ ارض القرآن کا مطالعہ

ڈاکٹر محمد ذہیب حنیف
آغاخان یونیورسٹی اگزامنیشن بورڈ، کراچی
zaibizohaib26@gmail.com

قرآنِ مجید ایک ہمہ گیر، ہمہ جہت اور ہدایت کی آخری کتاب ہدایت ہے۔ اس میں تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی اور تمدنی حقائق کا گہرا بیان موجود ہے۔ ان پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو 'ارض القرآن' یا قرآنی جغرافیہ ہے، جس کا مقصد اُن مقامات، شہروں، وادیوں، پہاڑوں اور جغرافیائی نشانیوں کو سمجھنا ہے جن کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اس ضمن میں متعدد علمی و تحقیقی کتب سامنے آئی ہیں جو اس میدان میں فکری راہنمائی فراہم کرتی ہیں: جیسے مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی کتاب 'ارض القرآن یا جغرافیۂ قرآن' جو اس میدان میں اولین کاوشوں میں سے ایک ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا 'سفر نامہ ارض القرآن' ایک روحانی و فکری سفر نامہ ہے جو قرآن میں مذکور خطوں کا مشاہداتی و فکری تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں 'اطلس القرآن' از ڈاکٹر شوقی ابو خلیل (اردو ترجمہ: حافظ محمد امین) ایک بصری اور نقشہ جاتی رہنمائی فراہم کرتا ہے جو قاری کو قرآن کے جغرافیائی ماحول سے قریب کرتا ہے۔ ایک اور کتاب 'جغرافیۂ قرآن' از انتظام اللہ شہابی مبتدیوں کے لیے کافی کارآمد ہے۔ یہ تمام کتب اپنی مثال آپ ہیں، لیکن ان میں مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب 'تاریخ ارض القرآن' اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ایک جامع تاریخی و جغرافیائی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اس کتاب میں قرآنِ مجید کے پس منظر میں جغرافیائی مقامات کا تاریخی تناظر میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ سید سلیمان ندویؒ (متوفیٰ ۱۹۵۳ء) کا نام برِّصغیر کی علم و فضل، تدبر اور اپنی بصیرت میں ممتاز و یگانہ شخصیات میں سرِ فہرست ہے۔ آپ معروف سیرت نگار، مؤرخ، ادیب اور محقق تھے۔ آپ کا اصل کارنامہ سیرت النبی ﷺ کی

تصنیف ہے جس کی پہلی دو جلدیں علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) نے لکھی۔ اُن کی وفات کے بعد مزید پانچ جلدیں سید سلیمان ندوی نے لکھ کر ایک تاریخ رقم کر دی۔ سید سلیمان ندوی کی معروف تصانیف میں خطباتِ مدراس، نقوشِ سلیمان، حیاتِ شبلی، یاد رفتگان، عرب و ہند کے تعلقات، عمر خیام، ارض القرآن شامل ہیں۔ زیرِ موضوع آپ کی معروف کتاب 'تاریخ ارض القرآن' کا ایک جائزہ پیش کیا جائے گا۔

تاریخ ارض القرآن دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر جیسے کہ قرآنِ مجید میں جن تاریخی مقامات کا ذکر ہے، اُن آیات کی تفسیر، سرزمینِ قرآن (عرب) کا جغرافیہ، نیز قرآنِ مجید میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر اور اُن کی تاریخی تحقیق۔ جلد دوم میں تحقیق کا پورا محور حضرت سارہؑ، حضرت ہاجرہؑ اور قطورہؑ پر مشتمل ہے۔

ارض القرآن کی تصنیف کے مقاصد میں مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ قدیم و جدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن (عرب) کے حالات مذکورہ کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآنِ مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکار ہو جائے..... نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی اور دوسری طرف غیروں کو انھیں افسانہ کہنے کی جرأت ہوئی۔[1]

اس کتاب کی سب بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اصلی مآخذ کا سہارا لیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے جب توریت کی طرف رجوع کیا تو اُنھیں اس کے مختلف تراجم میں تضاد نظر آیا۔ بقول مصنف، انھوں نے "ترجمے پر انحصار کے بجائے عبرانی زبان کو سمجھنے کے لیے تین مہینے صرف کیے"۔[2] ایک محقق کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ثانوی مآخذ کے بجائے اصل مآخذ کی طرف جاتا ہے۔ ان مآخذ تک رسائی کے لیے ایک دن یا چند دن درکار نہیں ہوتے، بلکہ اس کے لیے، صبر، جذبہ، شوق اور لگن درکار ہے۔

تاریخ ارض القرآن کے مآخذ: مصنف نے اس کتاب کے لیے جن بنیادی مآخذ سے استفادہ

---

[1] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء، ۱/۱۱۔
[2] ماخذ سابق، ۱/۱۳۔

کیا ہے وہ چار ہیں: ۱- ادبیاتِ اسلامیہ، ۲-ادبیاتِ اسرائیلیہ، ۳- ادبیاتِ یونانیہ و رومانیہ، ۴-اکتشافاتِ اثریہ۔ یہاں ان چاروں مآخذ کو مختصراً سمجھا جائے گا۔

۱- ادبیاتِ اسلامیہ: اس میں مصنف نے پانچ ذرائع کو لیا ہے جو قرآنِ مجید، روایاتِ تفسیر، اسرائیلیات، خاندانی روایات اور عرب کے اشعار اور امثال ہیں۔

الف- قرآنِ مجید: قرآنِ مجید میں مذکور جن قوموں کے حالات بیان ہوئے ہیں، انھیں موضوعِ بحث لایا گیا ہے۔ قرآنِ مجید ابدی اور سرمدی ہدایات کا مجموعہ ہے جس میں وہ تاریخی حقائق بیان ہوئے ہیں جن کی سچائی یا تو گذرے وقتوں نے ثابت کیے یا پھر آنے والا وقت ثابت کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الروم کی ابتدائی آیات دیکھیے: الٓمّٓ، غُلِبَتِ الرُّوْمُ[۳] (ترجمہ: الم۔ رومی مغلوب ہوگئے)۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب رومیوں کو ایرانیوں نے شکست سے دوچار کیا۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ جس طرح ایران نے شکست دی ہے، آنے والے وقتوں میں رومی غالب آجائیں گے۔ پھر وقت نے ثابت کیا اور کچھ ہی عرصے میں رومی غالب آگئے۔

۲- روایات: مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں آنحضرت محمد ﷺ اور صحابہؓ سے جو حدیثیں نقل کی ہیں، اُن کی تفصیلات بیان کی ہیں، لیکن مصنف کے نزدیک صحیح طور سے ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یعنی مفسرین نے جو آیات کی تفسیر میں روایات بیان کی ہیں، وہ سنداً اتنی قوی نہیں ہیں۔

۳-اسرائیلیات: مصنف نے اسرائیلیات پر اعتبار نہیں کیا۔ اُن کے نزدیک "اکثر یہ روایات صحیح المأخذ نہیں، اور اسی لیے اس میں ہزاروں بے سروپا باتیں موجود ہیں جو اصل روایت کی رو سے تمام تر ضعیف بلکہ جھوٹ ہیں"[۴]۔ اسرائیلیات کا معاملہ عجیب ہے، ان میں اتنی کہانیاں ہیں کہ اگر کوئی افسانہ پڑھنے کا شوقین ہو، تو اس سے بہتر ذخیرہ اُسے شاید ہی کہیں ملے۔ مثلاً: سیدنا سلیمانؑ کے دور میں دو فرشتے ہاروت و ماروت کا بطور امتحان دنیا میں آنا، اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں واضح طور پر کہہ دیا کہ یہ بطورِ آزمائش بھیجے گئے تھے (البقرۃ: ۱۰۲)، لیکن ان دو فرشتوں کے

---

[۳] القرآن، ۳۰:۲

[۴] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۱/ ۱۶۔

حوالے سے جو اسرائیلی روایات ہیں اُن پر سوائے استغفار کے اور کچھ نہیں پڑھا جا سکتا۔

۴-خاندانی روایات: خاندانی روایات عربوں میں نسلاً بعد نسلٍ محفوظ چلے آ رہے تھے۔ بعد از اسلام کتابوں میں مدون ہو گئے۔

۵-عرب شاعری: عرب تاریخ کو سمجھنے کا ایک ذریعہ عرب شاعری بھی ہے جن میں سینکڑوں واقعات، رسوم اور عادات کا ذکر ہے۔ مصنف کے بقول یہ گراں قیمت سرمایہ ہمارے پاس اسلام سے چند صدی پیشتر سے زیادہ کا نہیں ہے۔ مثلاً: قومِ عاد کے حوالے سے ایک مثال لکھتے ہیں کہ مؤرخ طبری نے عاد کے حالات میں لکھا ہے: "بعض ایرانیوں نے عاد سے انکار کیا ہے، حالانکہ اشعارِ جاہلیت میں ان کا تذکرہ نہایت ہی کثرت سے ہے"[۵]۔ جاہلیت کے اشعار سے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> قرآنِ مجید جس زبان میں اُترا ہے وہ نہ تو حریری و متنبی کی زبان ہے، نہ مصر و شام کے اخبارات و رسائل کی، بلکہ وہ اس ٹیکسالی زبان میں ہے جو امراء القیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے ہاں ملتی ہے۔ اس وجہ سے جو شخص قرآن کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورِ جاہلیت کے شعراء و ادبا کے کلام کے محاسن و معایب کے سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔[۶]

مذکورہ بنیادی ذرائع سے مصنف کے بہ قول جو کچھ سرمایہ مدون ہوا، اُس کا ملخص یہ ہے:

۱-کتبِ تفسیر: ارض القرآن سے متعلق مولانا ندوی نے عربی کی جن تفاسیر سے استفادہ کیا ان میں یہ شامل ہیں: تفسیرِ مجاہد بن جبیر (المتوفیٰ ۱۰۳ھ)، تفسیرِ ابن حیان (المتوفیٰ ۳۴۹ھ) اور تفسیر بغوی (المتوفیٰ ۵۱۶ھ) وغیرہ۔

۲-تاریخِ عرب: اس ضمن میں مصنف نے چند مؤرخین کے نام دیے ہیں، جن میں عبید بن شریر، ابو عبیدہ، عوانہ بن حکم، ہشام کلبی، قاضی ابو الخیر اور ابنِ ہشام شامل ہیں۔[۷] اگرچہ ان مؤرخین کی کتب نایاب معلوم ہوتی ہیں سوائے ابن ہشام کے، لیکن مصنف نے ابن الندیم کی

---

[۵] ماخذ سابق، ۱/۱۶، ۱۷۔

[۶] امین احسن اصلاحی، مولانا، تدبرِ قرآن، فاران فاؤنڈیشن، نومبر ۲۰۰۹، ۱/۱۵۔

[۷] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۵ء، ۱/۱۷۔

"الفہرست" سے ان مؤرخین کی کتب کے نام دیے ہیں جن میں: کتاب اخبار الملوک الماضیین، کتاب مغارات قیس والیمین، کتاب ایام بنی مازن۔ تاریخ عرب کے حوالے سے اگرچہ اب اردو میں بھی کتب دستیاب ہیں، جیسے کہ "تاریخ عرب قدیم" از عبداللہ العمادی، "تاریخ عرب و قریش" از ڈاکٹر طاہر القادری (سیرت الرسول، جلد دوم) اور تاریخ عرب از فلپ حتی، مترجم: پروفیسر سید مبارز الدین رفعت وغیرہ۔ لیکن سر سید احمد خان کی کتاب "تاریخ عرب" اپنی ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں حوالہ جات کے لیے زیادہ تر توریت سے استفادہ کیا ہے، جس سے کتاب کی وقعت بڑھ جاتی ہے، تاہم اسرائیلی روایات میں لغزشیں زیادہ نظر آتی ہیں۔

۳- جغرافیۂ عرب: مسلمان اہلِ علم نے علمِ جغرافیہ پر بہت توجہ دی۔ پہلے زمانے کے مسلمان دنیا بھر میں تبلیغ، جہاد، حصولِ علم، سیاحت اور تجارت کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ انھوں نے طرح طرح کے جغرافیائی اکتشافات کیے جس کا فائدہ پوری امتِ مسلمہ کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کو ہوا۔ عام طور پر جغرافیہ کے حوالے سے یونانیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اس ضمن میں لکھا ہے:

> مسلمانوں میں جغرافیہ کی ابتدا خود عرب سے ہوئی ہے کہ وہ ان کا وطن تھا اور اس کی ابتدا انھوں نے اس وقت کی جب یونانیوں کے لفظ 'جغرافیہ' سے بھی اُن کو واقفیت نہ تھی..... اس فن پر دو قسم کی کتابیں ہیں، ایک وہ جن میں مخصوص طور پر عرب کا جغرافیہ ہے، دوم وہ جن میں دیگر ممالک کے جغرافیہ کے ساتھ عرب کا بھی تذکرہ ہے۔ [۸]

مصنف نے جغرافیہ سے متعلق معروف کتب کا حوالہ دیا ہے۔ اگرچہ ان کتب کی فہرست طویل ہے، تاہم چند معروف کتب کے نام کا ذکر کرنا ضروری ہیں جیسے کتاب الصافات از نضر بن شمیل (عرب کے خیمے گاہوں، پہاڑوں اور گھاٹیوں کے بیان میں ہے)، کتاب جزیرۃ العرب از ابوسعید الاصمعی (جو پہلی عام جغرافیۂ عرب معلوم ہوتی ہے)، کتاب البلدان از ابن فقیہ ہمدانی (مکہ، طائف، یمامہ اور یمن کا ذکر ہے)۔

۴- انساب: علم الانساب وہ علم ہے جس نے عربوں کو دنیا کی دوسری تہذیبوں کے برعکس ممتاز

---

[۸] ماخذ سابق، ۱/۲۰۔

بنادیا تھا۔ ”زمانۂ جاہلیت میں اور بعد اسلام بھی عرب میں بڑے بڑے علمائے انساب گزرے ہیں جو عرب کے تمام قبائل کے اور اکثر ہر قبیلے کے مشاہیر کے نسب سے واقف تھے۔“[۹]

۲-ادبیاتِ اسرائیلیہ: ادبیاتِ اسرائیلیہ کا مجموعہ توریت، کتبیم، نبییم، ترگوم، مدراش اور تلمود سے عبارت ہے۔ یہودیوں کے یہاں مدِراش کا درجہ ہمارے یہاں کی احادیث کا ہے۔ مصنف کے بہ قول ”اسلام میں جو اسرائیلیات کا سرمایہ ہے، وہ زیادہ تر ان ہی ترگوم، مدراش (مدراس) اور تالمود سے ماخوذ ہے“[۱۰]۔ یاد رہے کہ قدیم مفسرین نے اپنی تفسیر میں اسرائیلی روایات کا کافی سہارا لیا ہے۔ مثال کے طور پر طبری نے ہر طرح کی اسرائیلی روایات اپنی تفسیر میں شامل کر دی ہیں، تاہم، بعد میں مفسرین نے اس معاملے میں احتیاط برتی اور ان روایات کو پرکھنے کے لیے اصول وضع کیے گئے تاکہ صحیح اور غلط میں فرق نظر آسکے۔ اس کی ایک عمدہ مثال تفسیر ابن کثیر اور اردو زبان میں مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن ہے، جس میں اسرائیلی روایات کو تحقیق کے ساتھ شامل کیا ہے۔

۳-ادبیاتِ یونانیہ ورومیہ: یونانی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے، جس کا ادب آج تک انسانیت کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ ارسطو، افلاطون اور دوسرے فلاسفہ، آج بھی دنیا کے لیے ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ میں یونانی مؤرخوں کی ایک الگ اہمیت ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے لکھا ہے:

> یونانی اور رومانی [رومی] مؤرخوں، سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے جستہ جستہ اور متفرق طور پر ان ملکوں اور قبیلوں کا ذکر کیا ہے جن کا قرآن میں نام ہے۔ ان میں سے بعض مصنفین خود ان قبیلوں اور قوموں کے معاصر تھے اس لیے اُن کی اطلاع قابل اطمینان ہے۔ ان کا سلسلہ ہیروڈوٹس..... سے چھٹی صدی عیسوی کے مؤرخوں تک ختم ہوتا ہے۔ ان مؤرخوں، سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں میں ہیروڈوٹس (ق م) تھیو فرائٹس (ق م) ڈیڈوریس (نشرق م) اسٹرابو پلینی (سر) بریبلوس (سنشہ) بطلیموس انطالیہ قابل ذکر ہیں، ان میں سے ہیروڈوٹس، ڈیڈوریس،

---

[۹] ماخذ سابق، ۱/۲۴۔

[۱۰] ماخذ سابق، ۱/۲۷۔

اسٹرابو، پلینی اس باب میں مشہور ہیں اور بطلیموس مشہور تر.....[۱۱]

۴-اکتشافاتِ اثریہ: آثار کسی بھی قوم کی تاریخ، حالات و واقعات پر اگرچہ مکمل طور پر نہیں لیکن کافی حد تک روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمیں جو آثار ملتے ہیں، ان میں ہمیں کسی قوم کا تمدن، تاریخ، معاشرت زبان اور رہن سہن وغیرہ کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آج موہن جوڈارو کے جو آثار ملے ہیں ان سے ہمیں یہ آگاہی ہوئی کہ اس خطے میں بسنے والے لوگوں کا رہن سہن، کھانا پینا، معاشرت اور تعمیرات کس طرح کی تھیں۔ اسی طرح اگر ہم اہرامِ مصر کو دیکھیں، تو ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے تحقیق سے واضح کر دیا کہ یہاں فراعنہ کی جو ممیاں ہیں، اُن کی عمریں کتنی ہیں، اُن کی زبان، رہن سہن کیا کیا تھے، وغیرہ۔

مصنف نے اکتشافاتِ اثریہ کے حوالے سے مختلف آثار کی حقیقت بیان کی ہے، مثلاً: یمن اور حضرت موت کے ضمن میں لکھا ہے:

> یمن، حضر موت، تدمر، بطرا، علا، مدائن صالح، صفا، حجر، حجاز، عراق اور مصر میں قدیم عربوں کے بہت سے آثار، عمارات اور یادگاریں جن میں ہزاروں کتبے اور نقوش گھرے ہیں...۔ ان آثار کی تحقیقات کی گئی اور اُن میں سے اکثر خطوط اور زبانوں سے اُس عہد کے علما واقف تھے۔[۱۲]

تاریخ کے حوالے سے ایک مؤرخ کو جو مشکلات پیش آتی ہیں اس کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ایک مؤرخ کو صحیح سن، تاریخ اور تعینِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات وغیرہ کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے، وگرنہ تاریخ میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات و واقعات کی وجہ سے اصل واقعہ بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے ذرائع سے کیسے استفادہ کیا جائے اور زمانے کا تعین کیسے کیا جاتا ہے، اس حوالے سے مصنف نے لکھا ہے:

> تاریخ کے صرف تین ذرائع ہیں: توریت بالکل خاموش ہے، روایاتِ عرب جن میں تاریخ و سنین کا ذکر نہیں، آثارِ قدیمہ اور الواح منقوشہ جن میں سے صرف چند شاہانِ عرب کی تاریخ یا تاریخی فتوحات معلوم ہوتی ہیں...۔ اسی طرح زمانہ کے تعین کا اصول یہ ہے کہ چار پشتوں کی ایک

---

[۱۱] ماخذ سابق، ۱/۲۸۔

[۱۲] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۵ء، ۱/۳۲۔

صدی فرض کر کے پشتوں کے شمارے سے زمانے کی تعین کر لی جاتی ہیں۔[۱۳]

جغرافیۂ عرب: اس موضوع میں عرب جغرافیہ سے متعلق مختلف مآخذ کو سامنے رکھ کر تفصیلی بحث کی ہے، جیسے کہ 'جغرافیہ از توراۃ'۔ اس حوالے سے توریت میں جو کچھ مذکور ہے اسے مع حوالہ پیش کیا، مثلاً: وہ لکھتے ہیں "یونان کا پہلا مؤرخ اور جغرافیہ دان ہیروڈوٹس ہے...۔ یہ پہلا مصنف ہے جو واقفیت کے ساتھ عرب کا ذکر کرتا ہے"[۱۴] اس کے ساتھ اس موضوع یعنی جغرافیۂ عرب کو وسعت دیتے ہوئے، عہدِ قرآن، نجد، حجاز، جوف، ثمود، خیبر، مدین، عربِ شام اور عربِ عراق جیسے موضوعات پر تفصیلی بحث کی ہے جو ایک قاری کے پڑھنے کے لائق ہے۔

اقوامِ ارض القرآن: مولانا ندوی کے بہ قول تاریخ ارض القرآن (عرب) کو جن قوموں سے تعلق ہے، وہ عموماً امم سامیہ ہے۔ امم سامیہ سے کیا مراد ہے؟ ان کا مسکن کیا ہے؟ مسکنِ اول سے ہجرت، امم سامیہ کے انساب، طبقۂ اولیٰ میں امم سامیہ اولیٰ، جن میں عاد، عاد بابل میں، عاد مصر میں یا عاد دیگر ممالک میں، اور اس طرح کے دوسرے موضوعات کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

تاریخ ارض القرآن میں مختلف اقوام کا ذکر کرتے ہیں جن میں: عاد، عادِ ثانیہ، ثمود، قبیلہ بنو جرہم، حصار یا حضر موت، قومِ سبا، قومِ تبع واصحٰب الاخدود اور اصحٰب الفیل وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام اقوام کی تفصیلات قرآنِ مجید، نقشہ جات اور روایات کی روشنی میں بیان کی ہیں۔ اس ضمن میں اگرچہ مفسرینِ کرام نے اپنی تفسیروں میں نقشہ جات کو شامل نہیں کیا، تاہم انھوں نے تحقیق سے مقام کا تعین ضرور کر دیا جس سے ایک قاری کو آسانی یہ ہو گئی کہ وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جو اس ذکر کی گئی قوم کا مسکن ہوتا ہے، مثلاً: اصحٰب الاخدود کے حوالے سے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تین واقعات لکھنے کے بعد چوتھا واقعہ جو کہ سب سے مشہور تھا، اُس پر اطمینان کا اظہار کیا ہے، تصدیق کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> چھٹی صدی عیسوی کی متعدد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاخدود کے اس واقعے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، جن میں سے بعض عین زمانہ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سُن کر

---

[۱۳] ماخذ سابق، ۱/۴۶۔

[۱۴] ماخذ سابق ۱/۵۸۔

لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنف اس واقعے کے ہم عصر ہیں: ایک پروکوپیوس۔ دوسرا کوساس انڈیکو پلیوسٹس (Cosmos Indicopleustis) جو نجاشی ایلیسبوعان (Elesboan) کے حکم سے اُس زمانے میں بطلیموس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور حبش کے ساحلی شہر ادولیس (Adolis) میں مقیم تھا۔ تیسرا یونس ملالا(Johannes Malala) جس سے بعد کے متعدد مؤرخین نے اس واقعے کو نقل کیا ہے۔[۱۵]

جلد دوم میں مصنف نے سیدنا حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل کو قرآن، تاریخ اور مقامات کو مختلف نقشوں کے ذریعے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس حصے میں تحقیق کا پورا محور حضرت سارہؑ، حضرت ہاجرہؑ اور قطوراؑ پر مشتمل ہے۔ دیکھا جائے تو بنو قطورا میں حضرت شعیبؑ اور ان کے ضمن میں قومِ مدین اور اصحٰب الایکہ آتے ہیں۔ اہلِ مدین کے حوالے سے مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے لکھا ہے کہ:

مدین والے خانہ بدوش تھے اور خانہ بدوش قوموں کی متعین جغرافیائی مقامیت معلوم کرنا دشواری ہوتی ہے۔ اپنے خیمے ڈیرے لیے وہی قوم آج یہاں ہے اور کل دس میل ہٹ کر، تاہم، قدیم نوشتوں کی مدد سے اتا پتا چلتا ہے شہر مدین کا محلِ وقوع غالباً بحرِ احمر کے داہنی جانب شمال و مشرق میں تھا۔[۱۶]

مصنف نے قومِ مدین کو ایک منظم قوم کے طور پر پیش کیا ہے: "اہلِ مدین کے قبائل ایک منظم زندگی رکھتے تھے، شہر میں مذہبی رسوم و آداب کی تلقین و محافظت کے لیے کاہن (مذہبی عہدے دار) ہوتے تھے۔"[۱۷]

خانہ بدوش اور منظم زندگی میں تطبیق اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اگرچہ وہ خانہ بدوش تھے مگر مل جل کر رہنے والے تھے۔ بعض مفسرین نے اصحٰب الایکہ اور مدین کو ایک ہی چیز مانا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے لکھا ہے کہ "محققین نے (اصحاب الایکہ) کو اصحابِ مدین کا مترادف کہا ہے۔ اور ہمارے یہاں اکابر میں ابن کثیر اور نسفی نے اپنی تفسیر میں یہی قول اختیار کیا ہے۔ باقی

---

[۱۵] سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، جلد ششم، ادارۂ ترجمان القرآن، لاہور، س ن۔
[۱۶] عبد الماجد دریا آبادی، ارض القرآن، یا جغرافیہ قرآنی، لکھنؤ، ص ۱۲۔
[۱۷] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۲/ ۲۵۳۔

اکثر کا قول ہے کہ وہ دونوں متقارب لیکن الگ الگ قومیں تھیں۔"[۱۸] مصنف نے اصحٰب الایکہ سے متعلق جو تحقیق کی ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ مصنف نے مدین اور اصحٰب الایکہ کے بارے میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے، جس کا ملخص یہ ہے:

قرآن کی رو سے صاف ظاہر ہے کہ مدین اور ایکہ دوالگ الگ چیزیں ہیں، کیوں کہ دونوں قوموں کا حضرت شعیبؑ سے سوال وجواب، طرزِ خطاب اور آخراً بربادی اور طریقۂ بربادی مختلف ہے۔

سب سے بڑے اشتباہ کی صورت یہ ہے کہ عام معلومات کے لحاظ سے ان اطراف میں جنگل کا ذکر نہیں، حالانکہ قرآن نے "جنگل والوں" کہا ہے، ورنہ اہل تفسیر اور جغرافیہ داں اس کا ذکر ضرور کرتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مدین اور ایکہ کا کوئی شدید تعلق تھا۔

توریت نے قطورا (حضرت ابراہیم کی تیسری بیوی) کی متعدد اولاد میں سے صرف دو کی تفصیل کی ہے۔ بنو مدین کے متعلق یہ تحقیق معلوم ہے کہ بحرِ احمر پر خلیج عقبہ کے سامنے شہر مدین میں آباد تھے، اس لیے تسلیم کرنا چاہیے کہ بنو دوان بھی ان ہی سواحل پر مدین کے قریب آباد ہوں گے۔ توریت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ انھی اطراف میں آباد تھے۔

تیماء شمالی عرب میں جہاز سے شام کے راستہ پر واقع ہے اسی کے قریب ددان کو ہونا چاہیے۔ یمن سے سواحل بحر احمر کے کنارے کنارے حجاز ومدین سے گذر کر خلیج عقبہ کے کنارے سے نکل کر تیماء وغیرہ کو قطع کرتی ہوئی ایک نہایت قدیم ومشہور تجارتی سڑک واقع ہے جو قدیم زمانہ میں ہندوستان، یمن، مصر وشام کے کاروانوں کا تنہا راستہ تھا، اس راستے کا ذکر تمام قدیم جغرافیوں میں موجود ہے...۔ توراۃ کے لحاظ سے ددان بھی یہیں تھا اور قرآن کہتا ہے کہ اصحاب الایکہ بھی اسی سڑک پر ہے۔

اصحاب الایکہ (جنگل والوں) کے ملک کا ایک مشہور واضح شاہراہ (امام مبین) پر ہونا قرآنِ مجید نے بیان کیا ہے، بعینہٖ یہی بیان ایک یونانی جغرافیہ میں بھی ہے۔

ہمارے مفسرین کا بیان ہے کہ بلا استثنا تمام اصحٰب الایکہ ہلاک ہوگئے، لیکن قرآنِ مجید میں

---

[۱۸] عبد الماجد دریا آبادی، ارض القرآن، یا جغرافیہ قرآنی، ص ۱۲۔

اس قسم کا کوئی لفظ نہیں ہے، اسی بنا پر مفسرین کی زیادت قابلِ تسلیم نہیں۔[۱۹]

مصنف کے بہ قول کہ اصحٰب الایکہ 'ہلاک' ہوگئے سے متعلق قرآنِ مجید میں اس قسم کا کوئی لفظ نہیں، تاہم قرآنِ مجید میں واضح طور پر 'عقاب'[۲۰] کا لفظ آیا ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں جہاں نافرمان قوموں پر لفظ 'عقاب' آیا ہے، وہاں واضح طور پر اس قوم کی بربادی ہلاکت کی صورت میں ہی ہوئی ہے، مثلاً قومِ نوح کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے کہا، (ترجمہ:) "ان سے پہلے نوح کی قوم اور ان کے بعد کے گروہوں نے جھٹلایا اور ہر امت نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے رسول کو پکڑ لیں اور باطل کے ذریعے جھگڑتے رہے تاکہ اس سے حق کو مٹا دیں تو میں نے انہیں پکڑ لیا۔ تو میرا عذاب کیسا ہوا"۔[۲۱] اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ قوم بھی اپنی نافرمانی کی وجہ سے اللہ کے عتاب کا شکار ہوئی تھی۔ ارض القرآن سے متعلق دوسری کتب میں اصحٰب الایکہ سے متعلق زیادہ تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ مثلاً مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے اپنی کتاب 'جغرافیہ قرآنی' میں اس ضمن میں کوئی خاص بحث نہیں کی۔ جغرافیۂ قرآن کے مصنف انتظام اللہ شہابی نے بھی یہی لکھا ہے کہ اصحٰب الایکہ ہلاک ہو گئے[۲۲]۔ اسی طرح "اطلس القرآن" کے مصنف نے اصحٰب الایکہ کی تفصیلات کے بجائے صرف ایکہ کے معنی "درختوں کے جُھنڈ" اور ایک قول بیان کیا کہ جس کے مطابق اس شہر سے تبوک مراد ہے[۲۳]۔ اس پر مزید تحقیق کی جائے تاکہ مستقبل میں مزید چھپے راز کھل سکیں۔

بنو سارہ کے ضمن میں حضرت ایوبؑ کی تفصیلات از روئے قرآن و تاریخ واضح کی ہے۔ حضرت ایوبؑ کے علاج سے متعلق، جس میں وہ ایک چشمے سے صحت یاب (ملاحظہ ہو، سورۃ ص، ۴۲) ہو گئے تھے، کے ضمن میں عام طور پر مفسرین نے چشمے کے فضائل بیان کیے ہیں، مثال کے طور پر صاحبِ تفسیر ضیاء القرآن، پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

---

[۱۹] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۵ء، ۲/ ۲۶۶- ۲۶۹۔

[۲۰] القرآن، ۱۴:۳۸

[۲۱] القرآن، ۱۵:۴۰ اصل آیت یوں ہے: كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ۔

[۲۲] انتظام اللہ شہابی، جغرافیہ قرآن، انجمنِ ترقی اردو (پاکستان)، س ن، ص ۳۴۔

[۲۳] ڈاکٹر شوقی ابو خلیل، اطلس القرآن، مترجم: حافظ محمد امین، دار السلام، لاہور، س ن، ص ۱۲۳۔

..... حکمِ خداوندی کے مطابق آپ نے زمین پر پاؤں مارا، قدرتِ الٰہی سے چشمہ جاری ہو گیا..... اس پانی سے غسل کیا تو جسم کی ساری بیماریاں دور ہو گئیں، پھر اسے پیا تو اندر کے سارے روگ ختم ہو گئے۔ (۲۴)

سید سلیمان ندوی نے نہایت ہی سبق آموز اور فطری بات کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

سفر ایوب میں مذکور ہے کہ حضرت ایوب کس طرح اور کس علاج سے صحت یاب ہوئے۔ قرآن بتاتا ہے کہ خدا نے ان کو چشمہ کا نشان بتایا، جس میں نہانے سے اور اس کے پانی کے پینے سے بیماری جاتی رہی۔ یہ طریقۂ علاج بالکل مطابقِ فطرت ہے، طبعی چشمے جو طبقاتِ ارضی یا پہاڑوں سے بعض اجزائے کیمیاوی کے مخزن سے گذر کر ابلتے ہیں، مخصوص خواص رکھتے ہیں اور دنیا کے اکثر ممالک واکناف میں اب بھی خدا نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا ہے۔ (۲۵)

بنو ہاجرہ میں حضرت اسماعیل، آلِ غسان، اوس و خزرج، قیدار اور قریش سے متعلق سیر حاصل گفتگو کی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔

جلد دوم میں میں ایک باب 'السنۃ العرب قبل الاسلام یعنی اسلام سے پہلے عرب کی زبانیں' میں اسلام سے قبل مختلف اقوام کی زبانوں کی تحقیق کی گئی ہے۔ زبانوں کی بحث میں مصنف نے سامی زبانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: عربی، بابلی اور شامی۔ پھر اس کے ساتھ ہر زبان کے ساتھ ذیلی زبانوں کو بیان کیا ہے۔

عربی زبان کو وحیٔ الٰہی کی زبان کا درجہ خدا کی طرف سے دینے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مذہبی خیالات ادا کرنے کے لیے، جن کا عربی زبان میں اُس وقت تک وجود نہ تھا، ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جس میں ان خیالات کے ادا کرنے کے لیے الفاظ ہوں اور دیگر قدیم المذاہب زبانوں سے اس کا رابطہ اور ارتباط ہو..... تمام عرب میں ایسی زبان صرف قریش کی ہو سکتی تھی..... شعرائے عرب میں بھی اس موقع پر جب کہ عرب کے تمام گوشوں سے لوگ سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہو جاتے تھے..... یہی سبب ہے کہ شعرائے عرب کے قصائد کی زبانوں میں اختلافات کے باوجود ایک قسم کی ہم رنگی اور ہمواری پائی جاتی ہے۔ تمام عرب کو مخاطب

(۲۴) پیر کرم شاہ الازہری، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۹ھ، ۴/ ۲۴۵۔
(۲۵) سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۲/ ۲۷۹۔

کرنے کے لیے وحیٔ الٰہی کو اس قسم کی زبان درکار تھی۔[۲۶]

ادیانِ عالم: اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں چند ہی ادیان کا ذکر کیا ہے، جن میں یہود، نصاریٰ اور صابئ ہیں۔ جس طرح قرآنِ مجید نے انبیاء کے باب میں یہ واضح کر دیا کہ بعض کے قصے اللہ نے سنائے اور بعض کے نہیں[۲۷] بالکل ایسے ہی مذاہب کے باب میں بھی اشاروں کے ساتھ چند ہی ادیان کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے بھی تین ہی ادیان کو زیرِ موضوع بنایا ہے۔

کتاب کا آخری پیرا پڑھنے کے لائق ہے جس میں مصنف نے "رحمٰن" اور "رحیم" کی بحث کا خلاصہ انتہائی عمدہ انداز میں کیا ہے۔ عام طور پر رحمٰن اور رحیم سے متعلق مفسرین نے الگ الگ بحثیں کی ہیں، مثلاً مولانا مودودی نے ان دونوں الفاظ کو مبالغے سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے نزدیک "گورے" کے ساتھ "چٹّا" لگائے بغیر تشنگی رہتی ہے، ویسے ہی یہ رحمٰن ورحیم ہے[۲۸]۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک الگ زاویہ دیا ہے۔ ان کے نزیک "ایک خدا کی رحمت وجوش کو ظاہر کر رہی ہے، دوسری دوام وتسلسل کو"[۲۹]۔ مگر مصنف ایک نیا زاویہ پیش کرتے ہیں:

> قرآن کے ہر سورہ کا آغازہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے رحمان اور رحیم دو ہم معنی صفتوں کی یکجائی کی متعدد تاویلیں کی ہیں اور ان دونوں الفاظ کے معانی کے درمیان نہایت نازک اور دقیق فرق نکالے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک سب کوہ کاوی وموشگافی ہے۔ قرآن کے استعمال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے رحمن کا استعمال بطور صفت کے نہیں بلکہ بطورِ علم کے کیا ہے چنانچہ تمام قرآن میں ۵۳ دفعہ یہ نام خدا کے لیے آیا ہے، اس بناپر اس کو صفت قرار دینا صحیح نہیں ہے.....۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عرب میں دو متضاد جماعتیں تھیں جن میں سے ایک اپنے معبود کو اللہ اور دوسری رحمان کہتی تھی۔ اسلام ان دونوں کو یکجا کرتا ہے کہ تم جس کو اللہ کہتے ہو اور وہ جس کو رحمن کہتے ہیں حقیقت میں ایک ہی ذات کی دو تعبیریں ہیں، اور یہ باہمی اختلاف محض نزاع لفظی ہے۔ اس بنا پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی ہمارے

---

[۲۶] ماخذ سابق، ۲/۳۵۹۔

[۲۷] القرآن، ۴۰:۷۸

[۲۸] سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ادارۂ ترجمان القرآن، لاہور، ۱/۴۴۔

[۲۹] مولانا امین احسن اصلاحی، تدبرِ قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱/۴۹۔

نزدیک یہ ہیں: ہم اپنا کام اس خدا کے نام سے شروع کرتے ہیں جس کا دوسرا نام رحمٰن ہے اور جو رحمت والا ہے۔[۳۰]

خلاصۂ بحث: تاریخ ارض القرآن کے مطالعہ سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

- مصنف نے جلد اول میں قرآنِ مجید میں تاریخی مقامات کی تفسیر کے ضمن میں تفصیلی بحث کی ہے، جب کہ جلد دوم میں حضرت سارہؑ، حضرت ہاجرہؑ اور قطورہؑ کی تحقیق پر مشتمل ہے۔
- مصنف کے نزدیک ایک عرصے تک اس موضوع پر کوئی جامع کتاب نہیں تھی۔
- مصنف نے اس تحقیق کے واسطے بنیادی مآخذ کے لیے باقاعدہ عبرانی زبان سیکھی۔
- صاحبِ کتاب نے اس کی تدوین کے لیے چار بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا ہے:

۱-ادبیاتِ اسلامیہ، ۲- ادبیاتِ اسرائیلیہ، ۳-ادبیاتِ یونانیہ و رومانیہ، ۴- اکتشافاتِ اثریہ۔

- مصنف نے اسرائیلی روایات پر اعتبار نہیں کیا۔
- اصحٰب الایکہ اور اہلِ مدین کو مصنف نے الگ الگ قوم کے طور پر بیان کیا ہے اور اصحٰب الایکہ سے متعلق مصنف نے تفصیلی بحث کی ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے انھیں خانہ بدوش کہا ہے۔ مصنف کے نزدیک ان پر کوئی عذاب نہیں آیا، جب کہ قرآنِ مجید کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان پر بھی عذاب آیا ہے۔
- حضرت ایوبؑ سے متعلق 'چشمے' کی بحث میں مفسرین کے برعکس اسے 'قدرتی چشمہ' کہا ہے۔
- رحمٰن اور رحیم کی بحث میں مصنف نے مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے برعکس مصنف کے نزدیک عرب میں دو متضاد جماعتیں تھیں، ایک اپنے معبود کو اللہ اور دوسری رحمان کہتی تھی، اسلام نے دونوں کو یکجا کر کے واضح کر دیا کہ حقیقت میں ایک ہی ذات کی دو تعبیریں ہیں۔

---

[۳۰] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۲/ ۴۲۲۔

امن و ہم آہنگی میں اکبر کی خدمات :ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد اسامہ
گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
musama1@jmi.ac.in
ڈاکٹر نجم السحر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی
nsahar@jamiahamdard.ac.in

ہندوستان میں پہلے ہندومت کا ظہور ہوا جو صدیوں تک اکثریتی مذہب کے طور پر قائم رہا۔ اس کے بعد بدھ مت اور جین مت نے معاشرتی و فکری زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بدھ مت کے احیاء نے عدم تشدد، برابری اور رواداری کے اصولوں کو فروغ دیا، جب کہ جین مت نے سادگی اور پرہیز گاری کو اہمیت دی۔ قرونِ وسطیٰ میں سکھ مت نے بھی مذہبی ہم آہنگی، مساوات اور خدمتِ خلق کی قدریں ہندوستانی معاشرے میں رائج کیں۔ آٹھویں صدی میں اسلام کی آمد اور بعد ازاں مغل دور میں اس کا استحکام ہندوستانی سماج پر گہرے اثرات ڈالنے کا سبب بنا۔ اسلام نے توحید، عدل و مساوات اور اخوت و محبت کے پیغام کو رواج دیا۔ اسی طرح پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپی طاقتوں کی آمد کے ساتھ عیسائیت بھی ہندوستان میں داخل ہوئی اور رفتہ رفتہ یہاں ایک مستقل مذہب کے طور پر جڑ پکڑنے لگی۔ یوں برّصغیر کی سرزمین ایک ایسی مثال بن گئی جہاں مختلف مذاہب صدیوں تک ساتھ ساتھ پروان چڑھتے رہے۔ اس کثیر المذہبی و کثیر الثقافتی تنوع نے ہندوستانی معاشرے کو ایک منفرد رنگ عطا کیا، لیکن اس کے نتیجے میں باہمی کشیدگی اور تصادم کے واقعات بھی رونما ہوئے۔ سماجی تفریق، ذات پات کا نظام، مذہبی رسومات میں شدت اور اقتدار کے حصول کی کشمکش اکثر مختلف طبقات کے درمیان تناؤ کا باعث بنی۔ ہندو جاگیر دار، زمیندار اور راجپوت امراء سیاسی اور عسکری میدان میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔ ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ ایسے ماحول میں مسلم حکمرانوں کے لیے ایک بڑا سوال یہ تھا کہ مختلف

مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان توازن کیسے قائم رکھا جائے۔ ایک طرف اسلامی تعلیمات اور مسلم علماء کا دباؤ تھا، تو دوسری طرف غیر مسلم اکثریت کے سیاسی و سماجی مطالبات بھی تھے۔ اس لیے انہیں ایسی حکمت عملی اختیار کرنی تھی جو ریاست کے سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ سماجی ہم آہنگی کو بھی ممکن بنا سکے۔

مغل دور میں بادشاہ جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲-۱۶۰۵) کی شخصیت اس حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نے ایک ایسے وقت میں اقتدار سنبھالا جب مختلف مذہبی و سماجی طبقات کے درمیان کشمکش موجود تھی۔ اس نے ان چیلنجز کا مقابلہ مذہبی رواداری، صلح کل اور باہمی احترام کی پالیسیوں کے ذریعے کیا، اگرچہ ان پالیسیوں کے بعض پہلو اسلامی نقطۂ نظر سے محلِّ نظر ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اقدامات نے ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی جہت بخشی، کثرت میں وحدت کا تصور اجاگر کیا اور بڑی حد تک معاشرتی استحکام پیدا کیا۔ زیرِ نظر مقالے[1] کا مقصد اکبر کی رواداری اور امن قائم کرنے پر مبنی اہم پالیسیوں کا تحقیقی و تجزیاتی جائزہ لینا اور اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کی وضاحت کرنا ہے، کیوں کہ اس حوالے سے مؤرخین اور علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ مؤرخین اسے ایک ایسا حکمراں قرار دیتے ہیں جس نے ہندوستانی معاشرے کو "کثرت میں وحدت" کا عملی نمونہ بنا کر دکھایا۔ دوسری طرف بعض علماء اور محققین کے نزدیک اس کی متعدد پالیسیوں میں مذہبی انحراف اور شریعت سے دوری جھلکتی ہے۔ اس متضاد صورت حال میں یہ سوال اہم ہے کہ اکبر کی کوششیں کس حد تک ہندوستان میں امن و ہم آہنگی

[1] اس مقالے میں بنیادی طور پر ملا عبد القادر بدایونی، ابو الفضل اور ابو الفیض فیضی وغیرہ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان کا تعلق اکبر کے دربار سے تھا، نیز اس میں درج مختلف شخصیات کا مختصر اتعارف بھی زیادہ تر انہی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ ملا عبد القادر بدایونی (۱۵۴۰ - ۱۶۱۰) جے پور ریاست کے ایک گاؤں تھونڈہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۵۷۴ میں اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ "منتخب التواریخ" کا شمار ان کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ ابو الفضل (۱۵۵۱- ۱۶۰۲) اور فیضی (۱۵۴۷- ۱۵۹۵) کے والد شیخ مبارک ناگوری (۱۵۰۵ - ۱۵۹۳) تھے، جو ایک یمنی الاصل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آباء و اجداد پہلے سندھ، پھر ناگور پہنچے۔ شیخ مبارک یہیں پیدا ہوئے، پھر وہ احمد آباد ہوتے ہوئے آگرہ آئے اور اسی جگہ ان کے دونوں کی بیٹوں کی پیدائش ہوئی۔ اکبر کے مذہبی خیالات کی تشکیل میں شیخ مبارک اور ان کے دونوں بیٹوں ابو الفضل اور فیضی کا اہم کردار رہا۔ یہاں طوالت کے پیش نظر دین الٰہی یا توحید الٰہی سے متعلق تفصیلی گفتگو سے اجتناب کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مقالہ میں موجود حوالوں کے علاوہ مختلف علماء اور مؤرخین کے افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے ان کی کتابوں یا ان کی تحریروں کے حوالے دیے گئے ہیں، تاکہ حسب ضرورت ان سے استفادہ کیا جا سکے۔

قائم کرنے میں کامیاب رہیں؟ بہر حال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کی کوششوں نے ہندوستانی تاریخ میں ایک منفرد مثال قائم کی اور یہ ثابت کیا کہ کثرت میں وحدت ممکن ہے۔ ان پالیسیوں میں بعض مذہبی پہلو کمزور تھے، لیکن سیاسی و سماجی اعتبار سے اس نے تنوع کو طاقت میں بدلا۔ یہی پہلو اسے دیگر حکمرانوں سے ممتاز بناتا ہے۔

اکبر میں امن و ہم آہنگی کے فکری و عملی محرکات: اکبر ایک ممتاز اور ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان عوامل کا جائزہ لینا ضروری ہے جو اس کی ذہنی و فکری تربیت میں شامل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ کئی عناصر اس کے نسب اور ماحول سے منتقل ہوئے تھے۔ اسے اپنے جد امجد بابر (۱۴۸۳-۱۵۳۰) کی جرأت و بہادری اور وسعت نظری[۲]، والد ہمایوں (۱۵۰۸ - ۱۵۵۶) کی صوفیانہ آزاد خیالی، حسن اخلاق، صبر و تحمل، سخاوت، درویشانہ صفات اور والدہ حمیدہ بانو بیگم (۱۵۲۷-۱۶۰۴) کا مذہبی لگاؤ و اعتقاد ورثے میں ملا تھا۔ اس کے شعور کی تشکیل میں چنگیز خان (۱۲۰۶- ۱۲۲۷) کے کارناموں کا بھی اہم کردار رہا۔ دوسرے

---

[۲] اکبر کی انتظامی پالیسیوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دادا کی اس وصیت کو پیش نظر رکھا تھا جس میں اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو ہندوستان کی کثیر المذاہب صورتِ حال کو مد نظر رکھتے ہوئے حکمرانی کے اصول بتائے ہیں کیوں کہ اکبر کی "صلح کل" والی پالیسی میں اس کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے: اے میرے بیٹے! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا مقام ہے کہ بادشاہوں کا بادشاہ (خدا) نے اس ملک کی حکومت تمہارے سپرد کی ہے۔ اس لیے تم پر لازم ہے کہ مذہبی تعصبات کو اپنے دل و دماغ پر غالب نہ آنے دو اور انصاف کو ہر حال میں قائم رکھو۔ لوگوں کی مذہبی حساسیت اور مختلف طبقات کے مذہبی رسم و رواج کا پورا لحاظ کرو، بالخصوص گائے کے ذبح سے اجتناب کرو، کیوں کہ اس سے تمہیں ہندوستان کے عوام کے دلوں میں جگہ بنانے میں مدد ملے گی، وہ تمہارے احسان مند ہوں گے اور یوں تم رعایا کے ساتھ شکر گزاری اور محبت کے رشتے استوار کر سکو گے۔ کسی بھی برادری کی عبادت گاہوں کو ہرگز نہ توڑو اور ہمیشہ عدل و انصاف کو اپنا شیوہ بناؤ، تاکہ بادشاہ اور رعایا کے تعلقات خوش گوار رہیں اور ملک میں امن و سکون قائم ہو۔ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے نہیں، بلکہ محبت اور نیکی کے ذریعے زیادہ بہتر طریقے سے کی جا سکتی ہے۔ شیعہ اور سنی کے باہمی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرو، ورنہ یہ اسلام کی کمزوری کا باعث بنیں گے۔ اپنی رعایا کی مختلف ضروریات اور حالات کو ویسے ہی سمجھو جیسے سال کے مختلف موسم ہوتے ہیں، تاکہ سلطنت کے جسم کو بیماری سے محفوظ رکھا جا سکے۔ T. Titus, Murrya, *Indian Islam,* Oxford University Press, 1930, pp. 156-157، یہ تحریر "تزک بابری" میں نہیں ہے لیکن یہ تحریر سابق ریاست بھوپال کی اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے اور اسی سے مختلف مؤرخین ڈاکٹر راجندر پرشاد، پروفیسر سری رام اور شیخ محمد اکرام وغیرہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: عبد الرحمان، صباح الدین، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۳، ص ۲۔

تیموری شہزادوں کی طرح اسے بھی یہ یقین تھا کہ خدا نے اسے تمام اقوام عالم کے لیے امن و آشتی اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ وہ بچپن سے ہی مغل، ترک، افغان اور ایرانی امراء سے میل جول رکھتا تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ فرقہ وارانہ تنگ نظری اور جماعتی تعصب سے محفوظ رہا کیوں کہ یہ وہ عناصر ہیں جو اکثر و بیشتر ایک انسان کو دوسروں کے عقائد و مسالک اور نظریات کو سمجھنے سے معذور کر دیتے ہیں۔ اس کے معلمین و مربیین میں مختلف مذاہب و مسالک کے پروردہ تھے، جہاں منعم خاں (۱۵۲۵- ۱۵۷۵)[۳] اور بایزید ترک سنی تھے، تو بیرم خاں (۱۵۰۱-۱۵۶۱)[۴] اور عبداللطیف قزوینی[۵] شیعہ تھے۔ انہوں نے اکبر کو صوفیانہ طرز فکر سے روشناس کرایا اور مولانا روم و حافظ کی شاعری سے اسے فکری و روحانی دولت عطا کی۔ دیگر اتالیق میں ملا پیر محمد خاں[۶]، حاجی محمد خاں اور مولانا اعظم الدین قابل ذکر ہیں۔ اکبر نے اتالیقی کے زمانے میں ہی صوفیوں، درویشوں اور مشائخ کرام سے عقیدت و احترام کے ساتھ ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔ بیرم خاں کی معزولی کے بعد یہ رجحان مزید بڑھ گیا اور وہ اکثر بھیس بدل کر فقیروں، جوگیوں اور سادھوؤں اور صوفیوں سے ملاقاتیں کرتا اور ان سے استفادہ کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ متین، کم گو اور غور و فکر میں منہمک ہوتا گیا۔ جب بھی اسے کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ

---

[۳] منعم خاں کا اصل نام منعم بیگ اور والد کا نام بیرم بیگ تھا۔ اس کا تعلق ترک قبیلہ سے تھا۔ اس نے ہمایوں کے لشکر میں معمولی درجہ سے ترقی کی اور بڑے ہی نازک وقت میں اس کا ساتھ دیا۔ اکبر نے اسے اپنے دور میں "خانِ خاناں" بنایا اور وہ ترقی کر کے پنج ہزاری منصب اور سپہ سالاری کے عہدے پر فائز ہوا۔ مشرقی اضلاع میں اس کی بنائی ہوئی مسجدیں اور عمارتیں، نیز جون پور کی تعمیرات اس کی یادگار ہیں۔ دریائے گومتی کا پل بھی اسی کا بنایا ہوا ہے جو ۹۷۵ ہجری میں تعمیر کیا گیا تھا۔

[۴] بیرم خاں بن سیف علی بیگ کے آباء واجداد کا تعلق ایران کے "قراقوئیلو" نامی ایک ترکمان قبیلہ سے تھا۔ وہ بدخشاں میں پیدا ہوا اور بلخ میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے سولہ سال کی عمر میں ہمایوں کی ملازمت اختیار کی۔ وہ علم کا قدردان، علم موسیقی کا رسیا، خلیق اور منکسر المزاج تھا۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس کے فارسی اور ترکی کلام کا دیوان بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ میدان جنگ میں ایک ماہر جرنیل، تو مسند وزارت پر مدبر سیاست داں اور منتظم حاکم تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بیرم خاں نہ ہوتا تو ہمایوں دوبارہ ہندوستان میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ ہی اکبر تخت نشین ہو سکتا تھا۔ اسے ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا بانی کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ اسے ۹۶۸ ہجری میں قتل کر دیا گیا۔

[۵] میر عبداللطیف قزوینی بن قاضی میر یحییٰ قزوینی عراق کے سادات حسینی سیفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ۹۶۳ ہجری میں ہندوستان آئے اور اکبر نے ان سے لسان الغیب حافظ شیرازی کا دیوان سبقاً سبقاً پڑھا۔ ۹۸۱ ہجری میں فتح پور سیکری میں ان کا انتقال ہوا اور قلعہ اجمیر میں ان کی قبر ہے۔

[۶] منتخب اللباب میں پیر محمد خاں کا تعلق دکن سے بتایا گیا ہے۔ وہ وہاں تین چار سال کسی جرم میں قید کی سزا کاٹ کر بیرم خاں کے پاس چلا گیا تھا اور اس نے اسے اپنے کتب خانہ کا داروغہ مقرر کیا تھا۔

اولیاء اور درویشوں سے مدد طلب کرتا۔ یہ کیفیت وسط ایشیا اور ایران کی اس روایت کا حصہ تھی جہاں فقیر پرستی عام تھی، چنانچہ اکبر بھی چشتیہ سلسلے اور بالخصوص شیخ سلیم چشتی[۷] کا معتقد تھا۔

اکبر ابتداء سے ہی ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھا جہاں مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے افراد موجود تھے، اس لیے اس کی فکر میں وسعت نظری اور کشادہ دلی پیدا ہوئی۔ اس کا سابقہ مسلم، ہندو، نومسلم، ترکی، افغانی، ایرانی اور عیسائیوں سے ہوا، چنانچہ اس نے اپنی بصیرت و صلاحیت، تجربات اور میل جول کی بنا پر کچھ ایسے بنیادی اصول وضع کیے جو بعد میں اس کے اعمال وافکار کی بنیاد بنے۔ اسے یقین تھا کہ کم از کم ہندوستان کے دو بڑے طبقات یعنی ہندو اور مسلمان کے درمیان اتحاد قائم کرنا اشد ضروری ہے۔ اس نے غیر مسلموں کو اس بات کا احساس دلایا کہ وہ خود کو ان کا بھی اتنا ہی محافظ سمجھتا ہے جتنا کہ مسلمانوں کا۔ اس کے ان افکار و نظریات کے نتیجے میں غیر مسلم بھی سلطنت مغلیہ کے استحکام اور امن و امان کے قیام میں شریک ہو گئے۔

اکبر میں موجود رواداری اور امن و امان قائم کی خواہش کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس دنیا سے نفاق اور کشمکش کا خاتمہ کر کے اسے ایک مقتدر اور مضبوط طاقت کے تحت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی، آپس میں برسرِپیکار ریاستیں ایک متحدہ نظام کے تحت صلح و آشتی کی فضا قائم کریں۔ وہ چاہتا تھا کہ مختلف العقیدہ طبقات میں مذہبی رواداری اور تہذیبی ہم آہنگی پیدا ہو، داخلی امن و سکون قائم ہو اور سلطنت کی خارجہ پالیسی بھی مستحکم ہو۔ اس کو یہ فکر اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ملی، جن میں عدل، مساوات اور اخوت پر خصوصی زور دیا گیا ہے، نیز اس نے اس سلسلے میں چنگیز خان کے تجربات سے بھی مدد لی، جس نے منتشر منگول قبائل کو ایک سیاسی ڈھانچے میں پرو کر ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس نے اپنے اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بے شمار زحمتیں برداشت کیں اور پورے ہندوستان کو ایک مرکزی حکومت کے تحت لانے کی جدوجہد کی تاکہ سلطنت میں یکساں انتظامیہ، عدلیہ اور مالیہ قائم ہو سکے اور زراعت و تجارت کے قوانین میں بھی ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔

---

(۷) شیخ سلیم چشتی (۱۴۷۸-۱۵۷۲) فرید گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا تعلق دہلی سے تھا۔ سلسلۂ بیعت میں وہ خواجہ ابراہیم سے متعلق تھے۔ انہوں نے بائیس حج کیے اور عرب میں وہ "شیخ الہند" کے نام سے مشہور ہوئے۔ متعدد مشائخ ان کی صحبت سے کامل ہو کر ان کے قائم مقام ہو گئے، ان میں شیخ کمال الوری، شیخ فتح اللہ قرین سنبھلی، شیخ رکن الدین اجودھنی اور حاجی حسین خادم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

امن و ہم آہنگی میں اکبر کی اصلاحات: اکبر کے طرزِ حکمرانی کا سب سے نمایاں پہلو اس کی رواداری اور امن و ہم آہنگی کا فروغ ہے، کیوں کہ یہ دونوں عناصر کسی بھی معاشرے کے قیام اور استحکام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسے احساس تھا ہندوستان کی کثیر المذاہب آبادی کو صرف عسکری قوت کے ذریعے قابو میں نہیں رکھا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے ایک ایسا سیاسی و سماجی ڈھانچہ درکار ہے جس میں سب کو برابر کے حقوق ملیں۔ اسی سوچ نے اسے "صلحِ کل"[۸] کے فلسفے تک پہنچایا۔ اس میں بنیادی طور پر سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور تعلیمی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا اور اسے صرف زبانی دعویٰ تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ اس پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

> سلطنت کی بنیاد انصاف اور مساوات پر ہو گی۔ کسی بھی شخص کے ساتھ مذہب، نسل، ذات، زبان اور قومیت کی بنیاد پر امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ ہر مذہب کے ماننے والے کو اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی ہو گی۔ قانون اور عدلیہ سب کے لیے برابر ہوں گے۔ سب کو انتظامیہ میں مساوی مواقع حاصل ہوں گے۔ امتیازی ٹیکسوں کا خاتمہ کیا جائے گا۔[۹]

---

[۸] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اکبر کے استاد عبداللطیف قزوینی نے اسے "صلحِ کل" کی پالیسی سمجھائی تھی۔ ملاحظہ ہو: Srivastava, Ashirbadi, *The Mughul Empire (1526-1803 A.D)*, Shiva Lal Agarwala & Company, Agra, 1986, p. 163۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اکبر کی "صلحِ کل" کی پالیسی دینِ الٰہی سے مختلف تھی۔ اول الذکر کا تعلق انتظامی اور سیاسی معاملات سے تھا اور اس کا آغاز اس کی حکومت کے بالکل ابتداء سے ہو گیا تھا۔ اس حوالے سے تزک جہانگیری میں ہے: "میرے والد کے سایۂ عاطفت میں ہر دین و مذہب کے افراد پرورش پاتے تھے، ان کا اپنا طریقہ صلحِ کل تھا۔ ہر قوم و مذہب کے اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے تھے"۔ (جہانگیر، نورالدین، تزک جہانگیری، مترجم: رام پوری، احمد علی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۵۷)۔ ثانی الذکر کا تعلق "دینِ الٰہی" یا آئین رہ نمونی یا "مریدی" وغیرہ سے تھا اور اس کی ابتداء حکومت قائم ہونے کے تقریباً پندرہ بیس سال بعد عبادت خانہ سے ہوئی اور پھر محضر (۱۵۷۹) سے ہوتے ہوئے عرف عام میں دینِ الٰہی تک پہنچ گئی۔ محضر کا مسودہ شیخ مبارک نے تیار کیا تھا اور اس پر مخدوم الملک شیخ عبدالنبی، قاضی جلال الدین ملتانی اور غازی خاں بدخشی وغیرہ کے دستخط مع مہر تھے۔ اس کے مطابق سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے پاس مجتہد کے مرتبے سے بڑھ کر ہے، لہٰذا اکبر عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر اگر دین کے ان مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں، کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام کا اجراء فرمائیں تو ان کی تجویز اور حکم متفق علیہ متصور ہو گا اور اس کی اطاعت و پیروی تمام رعایا پر لازمی ہو گی (شاہ بدایونی، ملا عبدالقادر، منتخب التواریخ، مترجم: فاروقی، محمود احمد، شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیویٹ لیمٹڈ پبلشرز، لاہور، سن اشاعت غیر مذکور، جلد دوم، صفحات ۴۷۷-۴۷۹؛ محمد اکرام، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، صفحات ۸۵-۸۷)۔

[۹] اس حوالے سے محمد اکرام نے اپنی کتاب "رود کوثر" میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہاں ان نکات کا تذکرہ بطور خلاصہ پیش

(الف) سیاسی اصلاحات: اکبر کی سیاسی پالیسی محض فتوحات یا حکومتی ڈھانچے سے متاثر نہیں تھی، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر وژن تھا، جس کا مقصد ہندوستان جیسے کثیر المذاہب اور کثیر الثقافات خطے کو ایک متحدہ سیاسی اکائی میں بدلنا تھا۔ اس کی پالیسی کے بنیادی عناصر میں سلطنت کی توسیع، راجپوتوں کے ساتھ مصالحت، مذہبی رواداری، مرکزی حکومت، فوجی و مالیاتی اصلاحات، اور خارجہ پالیسی شامل تھی۔ اس کی سیاسی بصیرت کا سب سے کامیاب پہلو اس کی راجپوتانہ پالیسی تھی، کیوں کہ اس نے ان کے ساتھ جنگ کے بجائے اتحاد قائم کیا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ وہ ان کے سماجی، مذہبی اور اقتصادی امور میں مداخلت یا ان کی ریاستوں کو براہ راست اپنی سلطنت میں ضم کرنا نہیں چاہتا ہے۔ اس کا صرف یہ مطالبہ تھا کہ وہ خود کو وفاقی سلطنت کا جزء سمجھتے ہوئے اس کے وفادار رہیں، راجگان سلطنت کے خزانے میں بطور خراج کچھ رقم جمع کرائیں، اپنے خارجی اور سیاسی تنازعات کو سلطنت کے سپرد کر دیں اور بہ وقت ضرورت فوجی خدمات فراہم کریں۔ اس کے بدلے میں سلطنت کے تمام عہدے اور مناصب ان کے لیے کھلے رہیں گے اور انہیں اس بات کا حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے ہم منصب افسروں سے بلا تفریق مذہب و نسل برابری کا مطالبہ کریں۔ اس کی اس رواداری پر مبنی پالیسی نے راجپوتوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ متعدد راجپوت سرداروں نے اکبر کی رانا پرتاپ (۱۵۴۰-۱۵۹۷) کے خلاف مہموں میں بھرپور حصہ لیا۔ ان میں راجہ رام ساہ، سال بھان، پرتاپ سنگھ، رائے لون کرن جگ ناتھ کے علاوہ خود رانا پرتاپ کے بھائی ساگر جی کا نام قابل ذکر ہے۔[۱۰]

سنہ ۱۵۶۲ میں اکبر کا بیکانیر کے کچھواہہ خاندان کے راجہ بھارامل [۱۱] کی بیٹی سے شادی کر کے

کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: رود کوثر، ۱۹۸۴، صفحات ۸۵-۸۷۔

[۱۰] ملاحظہ ہو: ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ص ۱۰۱

[۱۱] ۹۶۳ ہجری میں مارواڑ پر مشہور راجپوت کچھواہہ خاندان حکمرانی کر رہا تھا۔ راجہ کا نام بھارامل، بھاڑا مل تھا۔ ہیمو کی شکست کے بعد مجنوں خاں کے وسیلہ سے بھاڑا مل دربار اکبری میں باریاب ہوا۔ ۹۶۹ ہجری میں اس کی بیٹی سے، جس کا نام سروپی تھا، بعد میں عارف النساء بیگم رکھا گیا، اکبر کی شادی ہوئی۔ یہ مان سنگھ کی پھوپھی اور بھگوان داس کی بہن تھی۔ بھاڑا مل کے بعد اس کا بیٹا بھگوان داس اکبر کے مقربین میں شامل رہا۔ وہ چتوڑ، احمد آباد اور دیگر معرکوں میں ہمیشہ اکبر کے ساتھ رہا اور امیر الامراء کا خطاب پایا۔ اس کی وفات ۹۹۸ ہجری میں لاہور میں ہوئی۔

راجپوتوں کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کرنا[۱۲]، شہزادہ نورالدین محمد سلیم جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی مان بائی سے کرانا[۱۳]، راجہ مان سنگھ[۱۴] کو فوج کا سپہ سالار بنانا، راجہ ٹوڈر مل[۱۵] کو مالیات کا وزیر مقرر کرنا وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ تقرریاں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اکبر نے صرف سیاسی حکمتِ عملی نہیں اپنائی، بلکہ عملی طور پر ایک ایسی مشترکہ حکومت کی بنیاد رکھی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں طبقات کو برابر کا شریک بنایا گیا۔

اکبر بحیرۂ عرب میں پرتگالیوں کے وجود سے مطمئن نہیں تھا، جو ہندوستانی جہازرانی میں مداخلت کرتے تھے، مذہبی معاملات میں تعصب برتتے تھے، لوگوں کو تکلیفیں پہنچاتے تھے اور انہیں تبدیلیِ مذہب پر مجبور کرتے تھے۔ ۱۵۷۵ میں جب بادشاہ کی پھوپھی اور ایک شاہی بیگم

---

[۱۲] یہ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت تک اکبر کے ذہن میں اس فیصلے کے سیاسی اور مذہبی نتائج پوری طرح واضح ہو چکے تھے یا نہیں اور نہ ہی یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس فیصلے کے پس پردہ اصل محرک کیا تھا۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ وہ اس تدبیر کے ذریعے اپنے بعض ناقابلِ اعتماد امراء اور افغان سرداروں کا متبادل تلاش کرنا چاہتا ہو تاکہ حکومت کی بنیاد ایسے عناصر پر قائم ہو جو اس کے زیادہ وفادار، سیاسی طور پر پُرسکون اور مذہبی لحاظ سے روادار ہوں۔ اس میں حقیقت بھی نظر آتی ہے، کیوں کہ اس نے اپنے خاندان اور قبیلے کے متعدد افراد جیسے حکیم مرزا، ماہم انکہ، شہاب الدین احمد خاں اور ادہم خاں وغیرہ کی طرف سے ابتدا میں ہی کئی بغاوتوں کا سامنا کیا تھا۔

[۱۳] شادی کی پوری تفصیل "اکبر نامہ" میں موجود ہے (اکبر نامہ، جلد سوم، صفحات ۵۲۔۱۴۵؛ منتخب التواریخ، ص ۵۲۰)۔ جہانگیر کی شادی ۹۹۳ ہجری میں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے ہوئی تھی اور ۹۹۴ ہجری میں اس کی دوسری شادی راجہ اودے سنگھ کی لڑکی سے ہوئی تھی (تزک جہانگیری، صفحات ۱۳ -۱۴)۔

[۱۴] راجہ مان سنگھ راجہ بھگونت داس کچھواہہ کا بیٹا تھا۔ اکبر نے اس کے باپ کی وفات کے بعد اسے راجہ کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب عطا کیا اور مغل فوج کا سپہ سالار بنایا (شہنواز خان، صمصام الدولہ، مآثر الامراء، مترجم: قادری، محمد ایوب، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۹، صفحات ۱۶۲-۱۷۲)۔

[۱۵] ٹوڈر مل (۱۵۰۳-۱۵۸۹) کا تعلق پنجاب سے تھا اور وہ ذات سے کائستھ تھا۔ اس کے والد کا انتقال پانچ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ کی بدولت ضلع گجرات کی ایک پاٹھ شالہ میں حاصل کی۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ راجہ ہرچندرائے کا ملازم ہو گیا اور حساب میں مہارت کی وجہ سے اس کا مقرب خاص بن گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں شاہی منشی خانہ میں ملازمت اختیار کرلی اور ترقی کر کے صدر محاسب اور پھر وزیر خزانہ بن گیا۔ اسی نے اراضی کی پیمائش، حد بندی، محصول چنگی کے ضابطے، مردم شماری اور فوجی بھرتی کے قوانین مرتب کیے۔ فن حساب میں اس کا ایک قدیم رسالہ ہے، جس سے بنیوں اور مہاجنوں نے لمبے وقت تک فائدہ اٹھایا اور ایک کتاب "خازن اسرار" بھی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کا ایک حصہ دھرم سے متعلق ہے اور دوسرے حصے میں دنیاوی معاملات اور علم اخلاق پر گفتگو کی گئی ہے۔

زیارت مکہ کے لیے جارہی تھیں تو ان لوگوں نے بہت الجھنیں نے پیدا کیں[۱۶]، نیز ۱۵۸۲ میں انہوں نے دمن کو واپس لینے کی مہم کو ناکام بنایا اور سورت پر بھی دست درازی کی، جو مغل فوج کی بروقت مداخلت کے سبب ناکام ہوئی۔ اگر وہ پرتگالیوں سے نمٹنے کے لیے ایک مضبوط بحری فوج تیار کر سکتا تو ضرور کرتا، لیکن متعدد اسباب کی بنا پر یہ کام ممکن نہیں ہو سکا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ان لوگوں کو کم از کم بحیرۂ عرب سے نکال باہر کیا جائے اور اس میں دکن کی ریاستیں اکبر کا ساتھ دیں۔ یہی روشن خیالی اسے دکن کی مہمات کی طرف لے گئی۔ لہٰذا اس کی پالیسی کو محض ملک گیری یا ذاتی خواہشات کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں، بلکہ یہ ایک مدبر اور عظیم حکمراں کی دوراندیشی کا مظہر تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے مسلم ریاستوں کو سلطنت میں شامل کیا، لیکن کسی بڑی ہندو ریاست کو ضم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی سیاسی پالیسیوں نے ہندو مسلم تعلقات میں اعتماد پیدا کیا، داخلی بغاوتوں کو ختم کیا اور پوری سلطنت کو ایک متحدہ سیاسی قوت میں بدل دیا، نیز ہندو، مسلمان، جین اور دیگر مذاہب کے پیروکار ایک مشترکہ سیاسی نظام کے تحت متحد ہو گئے۔ اس سے معاشرے کی کشیدگی میں کمی واقع ہوئی اور عوامی سطح پر برداشت کے رجحان کو تقویت ملی۔

(ب) معاشرتی و معاشی اصلاحات: اکبر نے اپنے دور حکومت میں سماجی اصلاحات کے ذریعے ایک منصفانہ معاشرہ تشکیل دینے کی سعی کی۔ اس کی اصلاحات کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا، بلکہ غیر مسلم بھی ان سے یکساں طور پر مستفید ہوئے۔ اس نے ان ٹیکسوں کو ختم کر دیا جو عام لوگوں پر بوجھ تھے، جیسے درختوں، مویشیوں، نمک بازاروں، پگڑیوں، کھالوں، تیل، کمبل، رہائشی جائداد اور فصل کاٹنے کی اجازت پر لگنے والے محصولات منسوخ کر دیے گئے۔ اسی طرح تحصیل داروں، داروغوں، خزانے داروں اور سکہ جانچنے والے اہلکاروں کی فیس بھی ممنوع قرار دی گئی۔ یہ اقدامات براہِ راست غریبوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئے اور ان کی وجہ سے معاشرے میں

---

[۱۶] اکبر کی پھوپھی گل بدن بیگم اور اہلیہ سلیمہ بیگم حرمین شریفین جانا چاہتی تھیں، لیکن پرتگالیوں نے اس وقت تک سمندری راستے سے جانے کی اجازت نہیں دی، جب تک انہیں "دمن" کے قریب ایک گاؤں بلسر نہ دے دیا گیا۔ Tripathi, R.P, *Rise and Fall of the Mughal Empire,* Central Book Depot, Allahabad, 1981, p. 275۔ گل بدن بیگم بابر کی بیٹی تھی۔ اس نے ۱۵۷۵ میں شاہی خواتین کے ساتھ حج کے ارادے سے سورت کا رخ کیا، لیکن اگلے سال ہی مکہ جانا ہو سکا اور تقریباً ساڑھے تین سال بعد فتح پور سیکری واپس آ سکیں۔ سلیمہ سلطان بیگم بنت نورالدین محمد مرزا ہمایوں کی بھانجی تھی۔ اکبر نے ۹۶۵ ہجری میں جالندھر میں ان کی شادی بیرم خاں سے کرادی تھی، لیکن بیرم خاں کی وفات کے بعد اس نے سلیمہ بیگم سے خود شادی کر لی تھی۔

امن و سکون کی فضا قائم ہوئی۔ اکبر نے ریاست کے کوتوالوں اور عمالوں کو سختی سے ہدایت دی کہ اس کے احکام پر مکمل طور سے عمل کیا جائے اور رشوت خوری کا سد باب کیا جائے۔ اگر قحط سالی، آفاتِ ارضی و سماوی یا قیمتوں میں اچانک اضافے سے کسان نقصان اٹھاتے تو وہ محصولات میں انہیں رعایت دیتا۔ غریب کاشتکاروں کو بیج، مویشی اور آلاتِ زراعت کی خریداری کے لیے پیشگی سرمایہ بھی فراہم کیا جاتا تاکہ وہ اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر سکیں۔ اسی طرح مویشیوں کی دیکھ بھال اور ان کے لیے چراگاہوں کا بندوبست کیا گیا، جسے کسانوں نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شاہی اور حکومتی زمینوں پر "رعیت واڑی" نظام اور یکساں زرعی طرزِ عمل نافذ کر کے اکبر نے عوام کو زمینداروں اور جاگیرداروں کی زیادتیوں سے نجات دلائی اور انہیں معاشی اطمینان و سکون فراہم کیا۔

اکبر اس بات کا خواہاں تھا کہ رعایا کو ان کی بنیادی ضروریات مناسب قیمتوں پر میسر ہوں اور بازاروں میں عدل و انصاف، صفائی اور نظم و نسق برقرار رہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے بازاروں کے انتظام و انصرام کو ایک نظام کے تحت منظم کیا۔ ہر بازار کی نگرانی کے لیے ایک خزانچی اور ایک مشرف کا تقرر کیا جاتا تھا، جو قیمتوں کے تعین، ناپ تول کی درستگی اور اجناس کی دستیابی کو یقینی بناتے تھے۔ اکبر بسا اوقات خود بھی بھیس بدل کر بازاروں کا معائنہ کرتا تھا تاکہ رعایا کی حالت اور دوکان داروں کے رویّے کا براہِ راست اندازہ کر سکے۔ اس دوران عوام اور دوکاندار اپنے مسائل، شکایات یا سفارشات براہِ راست بادشاہ کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔ اس کے عہد میں مینا بازار[۱۷] کو خاص شہرت حاصل تھی۔ یہ بازار صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا، جہاں شاہی خواتین، درباری بیگمات اور دیگر عورتیں خریداری کے ساتھ ساتھ معاشرتی میل جول کا لطف بھی اٹھاتی تھیں۔ یہ صرف تجارت کا مرکز نہیں، بلکہ شاہی تہذیب کا ایک حسین مظہر تھا، جہاں زیورات، عطر، ریشمی کپڑے، بنارسی ساڑیاں، دست کاری اور سنگ تراشی کے نادر نمونے فروخت ہوتے تھے۔ یہ انتظامات نہ صرف عوامی بہبود کی علامت تھے، بلکہ اس بات کا مظہر بھی تھے کہ اکبر ایک منتظم،

---

[۱۷] ابوالفضل نے اپنی کتاب "آئین اکبری" میں "آئین ۲۳" میں خوش روز / مینا بازار کے تحت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہو: ابوالفضل، آئین اکبری، مترجم: طالب، محمد فدا علی، دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۸، جلد اول، صفحات ۴۱۲- ۴۱۳۔

مصلح اور رعایا پرور بادشاہ تھا، جو سلطنت کی اقتصادی و سماجی خوش حالی کو یکساں اہمیت دیتا تھا۔

اکبر نے ۱۵۸۲ میں شراب کی تیاری اور فروخت پر پابندی عائد کی، لیکن اس پابندی میں ایک رعایت بھی رکھی کہ چند مخصوص دکانداروں کو طبی ضرورت کے لیے شراب فراہم کرنے کی اجازت تھی۔ دیگر مذاہب کے پس منظر میں اس کے اس فیصلے نے معاشرتی نظم کو برقرار رکھتے ہوئے انسانیت کا توازن قائم رکھا۔ اسی طرح اس نے ۱۵۹۰-۱۵۹۱ء میں ختنہ کی عمر بارہ سال مقرر کی۔ شہر کی اخلاقی صف بندی کے لیے بھی واضح اقدامات کیے گئے، جیسے طوائفوں اور "بدچلن" عورتوں کو شہر کے مضافات میں مخصوص بستیاں دی گئیں اور وہاں آنے جانے والوں کے اندراج اور نگرانی کے احکام جاری کیے گئے، نیز جو افراد ان عورتوں کو اپنے گھروں میں لاتے پائے گئے، ان کے خلاف بھی وہی ضوابط لاگو کیے گئے۔ اگر کسی اونچے عہدے دار پر طوائف بازی کے الزامات ثابت ہوتے تو اس کو سزا یا سخت تنبیہ کے ذریعے احتساب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔[۱۸] اکبر کو مملکت میں موجود فقیری اور گداگری کے پیشوں نے بھی بے حد فکر مند رکھا۔ اس نے متعدد مرتبہ کہا تھا کہ اُس کی سلطنت سے فقیری اور افلاس کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے تحت پولیس کو ہدایت دی گئی کہ وہ بھکاریوں اور مشتبہ عناصر پر کڑی نظر رکھے، ان کے رہن سہن کا جائزہ لے، اور جن لوگوں نے تنگیٔ رزق کے باعث بھکاری پن اختیار کیا ہو، انہیں روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ دوسری جانب وہ ملنگوں اور قلندروں کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنے کے احکامات بھی جاری کرتا رہا۔

اکبر نے ۱۵۸۲ میں سالِ نو کے جشن[۱۹] کو اصلاحات کا ذریعہ بنایا۔ یہ رسم دہلی کے ترک

---

[۱۸] ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب "منتخب التواریخ" میں اسے "دین الٰہی" کی بدعتوں میں شمار کیا ہے اور طوائفوں کی بستی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسے حکومت کی طرف سے "شیطان پورہ" کا نام دیا گیا ہے۔ اس نے بہ حیثیت مجموعی ان تمام کاموں پر تنقید کی ہے اور اسے اکبر کی سماجی ناکامی قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، جلد دوم، صفحات ۴۹۹-۵۰۱۔

[۱۹] جشن کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۵۸۰- ۱۵۸۱ میں اکبر کو سخت ترین مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہندوستان میں مختلف بغاوتوں، کابل سے حملے اور لشکر کے اندرونی اختلافات نے اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا، لیکن وہ مستقل ثابت قدم رہا اور رفتہ رفتہ اس نے تمام مشکلات پر قابو پالیا۔ اس نے اپنی ان کامیابیوں کا جشن منانے کے لیے ۱۵۸۲ میں ایک سالانہ دربار بڑے شاندار پیمانے پر منعقد کیا اور تمام صوبائی گورنروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس میں شریک ہوں۔ اس کی تفصیل آر پی ترپاٹھی نے اپنی کتاب میں دی ہے، ملاحظہ ہو: *Rise and Fall of the Mughal Empire*, pp.271-272

سلاطین ایرانی بادشاہوں کی تقلید میں مناتے تھے، مگر اکبر نے اسے معاشرے کی بھلائی کے لیے تجاویز طلب کرنے کا موقع بنا دیا۔ ولی عہد اور امرائے دربار کو کہا گیا کہ وہ عوامی فلاح و بہبود کے لیے تجاویز پیش کریں۔ بادشاہ سلامت نے ان تجاویز کو نہ صرف سنا، بلکہ ان پر عمل درآمد کی یقین دہانی بھی کرائی۔ اس میں شک نہیں کہ ان پر عمل کرنے کی سنجیدہ کوششیں کی گئیں اور ان کے دوررس اثرات معاشرے اور عوامی زندگی پر نمایاں ہوئے۔ بعض اہم اصلاحات حسب ذیل ہیں:

اعلان کیا گیا کہ غلامی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور ان کی خرید و فروخت بھی ممنوع قرار دی گئی ہے، چنانچہ جنگی قیدیوں کو غلام نہ بنایا جائے۔ شہزادہ سلیم نے تجویز دی کہ بارہ سال کی عمر سے پہلے شادی نہ کی جائے۔ عزیز کوکا نے رائے دی کہ صوبے داروں کو بادشاہ کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل کرنے کا اختیار نہ ہو۔ عبدالرحیم خانِ خانان نے کہا کہ چھوٹے پرندوں کی حتی الامکان حفاظت کی جائے۔ راجہ ٹوڈرمل نے روزانہ محل میں خیرات تقسیم کرنے کی سفارش کی۔ یوسف خان نے مشورہ دیا کہ ہر شہر اور قصبے کی یومیہ رپورٹ حاصل کی جائے۔ بیربل نے اس تجویز کو مزید بہتر بنایا کہ اس مقصد کے لیے بااعتماد انسپکٹر مقرر کیے جائیں جو عوامی حالات اور غریبوں پر ہونے والے ظلم و ستم کی اطلاع بھیجیں۔ چیف انجینئر قاسم خان نے شاہراہوں پر سرائے اور مسافر خانے تعمیر کرنے کا مشورہ دیا۔ جمال نے سفارش کی کہ حاجت مندوں اور مظلوموں کو دربار تک لانے کے لیے مخصوص افسر مقرر کیا جائے۔ ملک الشعرا فیضی نے بازار میں اشیائے صرف کی قیمتیں مقرر کرنے کے لیے سرکاری محاسب تعینات کرنے کی رائے دی۔ ابوالفضل نے کہا کہ ہر شہر کا داروغہ دکانداروں کی فہرست تیار کرے اور ان کی آمدنی و خرچ پر نظر رکھے، نیز بیکار اور آوارہ افراد کو شہر سے نکال دیا جائے۔ حکیم ابوالفتح نے شفاخانوں کے قیام کی سفارش کی۔[۲۰]

اکبر اور سُیُورغال پالیسی: ابتداء ہی سے مسلم حکومتوں میں ایک روایت رہی ہے کہ علماء، فضلاء، اہلِ دانش، مفلس و نادار افراد، یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ ساتھ باعزت سلوک کیا جائے اور بے روزگار لوگوں کی کفالت اور سرپرستی کی جائے۔ یہ سرپرستی کبھی نقد امداد کی صورت میں ہوتی جسے "وظیفہ" کہا جاتا تھا اور کبھی زمین عطا کرنے کی صورت میں جسے مِلک، مددِ معاش

---

[۲۰] Tripathy, Rise and Fall of the Mughal Empire, pp.272-273

یا ''سُیُور غال''[۲۱] کہا جاتا تھا۔ مغل حکومت میں ان امور کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم تھا جس کے سربراہ کو ''صدر'' کہا جاتا تھا۔ اکبر کے ابتدائی دور میں یہ محکمہ شیخ عبد النبی[۲۲] کے زیرِ انتظام رہا، لیکن ان کے خلاف شکایتوں کے آنے پر اکبر نے نوٹس لیا اور فرید بخاری کے ذریعے انکوائری کرائی۔ تحقیقات کے بعد اس نے محکمہ میں بنیادی نوعیت کی اصلاحات نافذ کیں، جن کا تعلق مال گذاری سے تھا۔ سنہ ۱۵۸۰ میں اکبر نے جب پوری سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا تو ہر صوبے میں ایک صدر مقرر کر دیا اور ان پر ایک مرکزی نگراں بھی متعین کیا۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح کے معاملات مرکز تک محدود رہنے کے بجائے مقامی سطح پر زیادہ تیزی اور شفافیت کے ساتھ انجام پائیں۔ اس نے واضح کر دیا کہ جعل سازی اور سستی برتنے والے اہلکاروں کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ اس پالیسی سے جہاں غریب اور مستحق طبقات کو فائدہ ہوا، وہیں ریاست کے مالی وسائل بھی زیادہ مؤثر طور پر استعمال ہونے لگے۔ اگرچہ اس پالیسی پر ناقدین نے اعتراضات کیے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس کے ذریعے اکبر صدر کے اختیارات کم کر کے مذہبی طبقوں، بالخصوص جو اس کے مخالف تھے وہ معاشی طور پر کمزور کرنا چاہتا تھا۔

غیر مسلموں سے متعلق سماجی اصلاحات: اکبر نے جب رعایا کے تحفظ کو اپنا اولین فریضہ سمجھا تو اس نے غیر مسلموں کی معاشرتی زندگی کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ اس نے ۱۵۶۳ میں ہندوؤں کے متبرک مقامات پر عائد ''یاتری ٹیکس'' ہٹا دیا اور ۱۵۶۴ میں اس نے ہندوؤں سے جزیہ لینا بھی بند کر دیا۔ یہ فیصلہ غیر مسلم رعایا کو خوش کرنے اور ریاست پر اعتماد قائم کرنے کی ایک بڑی کوشش تھی۔ ان اقدامات سے ہندوؤں کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ

---

[۲۱] سیور غال کا مطلب ہے بادشاہ کی طرف سے عطا کردہ جاگیر، بالخصوص فوجیوں کے لئے۔ ابو الفضل نے اپنی کتاب ''آئین اکبری'' میں ''آئین ۱۹'' کے تحت سیور غال پر گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہو: آئین اکبری، جلد اول، صفحات ۴۰۲-۴۰۶۔

[۲۲] شیخ عبد النبی ابن شیخ احمد بن شیخ عبد القدوس کا اصل وطن اندری، علاقہ گنگوہ تھا۔ ان کا تعلق ایک مشہور مشائخ خاندان سے تھا۔ انہوں نے مکہ اور مدینہ میں علم حدیث کی تحصیل کی، لیکن واپس آکر تصوف کے مسلک کو ترک کر دیا اور علوم دین کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ ۹۷۲ ہجری میں جب مظفر خاں وزیرِ کل تھے تو شیخ اکبر کے دربار میں آئے اور اس کی سفارش پر صدر الصدور بنائے گئے۔ در حقیقت ملا مخدوم الملک کے اثرات کو کم کرنے کے لیے انہیں یہ اعزاز دیا گیا تھا۔ ابتدا میں اکبر ان کا بڑا معتقد تھا اور ان کے گھر پر حاضری دیا کرتا تھا، یہاں تک کہ اس نے ان کی جوتیاں تک سیدھی کی تھیں۔ شیخ کے زوال اور عبرت ناک انجام میں فیضی اور ابو الفضل کا اہم کردار رہا۔ ان کی وفات ۹۹۱ ہجری میں ہوئی۔

پیدا ہوا۔ اگرچہ بعض علماء نے اس پر شدید تنقید کی، لیکن سیاسی استحکام کے لحاظ سے یہ قدم مؤثر ثابت ہوا۔ ۱۵۷۸ میں اس نے بیوہ کی دوسری شادی کو قانونی طور پر جائز قرار دیا، جو ایک بڑی معاشرتی تبدیلی تھی۔ اس نے تعددِ ازدواج کو ناپسندیدہ قرار دیا اور یہ اصول طے کیا کہ مرد صرف اسی صورت میں دوسری شادی کر سکتا ہے جب پہلی بیوی بانجھ ہو۔ ۱۵۸۲ میں اکبر نے شادی کی قانونی عمر مقرر کی، یعنی لڑکیوں کے لیے چودہ سال اور لڑکوں کے لیے سولہ سال۔ شادیوں کے اندراج کے لیے قاعدہ وضع کیا گیا تاکہ ریکارڈ محفوظ رہے اور نابالغ شادیوں کی حوصلہ شکنی ہو۔[۲۳] اس نے قسم اٹھاتے وقت گرم گولا ہاتھ میں لینے یا کھولتے تیل میں ہاتھ ڈالنے جیسی آزمائشوں پر بھی پابندی لگائی۔ اسی طرح معاشرے میں صدیوں سے رائج ایک بھیانک رسم "ستی" تھی، اس سلسلے میں اکبر نے ۱۵۹۰-۱۵۹۱ میں یہ حکم صادر کیا کہ اگر کوئی بیوہ اپنی مرضی اور صاف الفاظ میں ستی ہونے کی خواہش ظاہر نہ کرے تو اسے ہرگز زندہ نہ جلایا جائے، نیز وہ عورتیں جو اپنے شوہر کے ساتھ ایک رات بھی نہ گزار پائی ہوں، ان پر ستی کی رسم ہرگز لاگو نہ کی جائے۔ اس کے اس فیصلے نے ہزاروں عورتوں کو ناحق جلنے سے بچالیا۔ اکبر کی یہ سماجی اصلاحات اس کی روشن خیالی اور انسان دوستی کی مظہر تھیں۔ اس نے عورتوں کو معاشرے میں بہتر مقام دلانے اور شادی کے ادارے کو منظم بنا کر ایک زیادہ متوازن اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

تعلیمی و ثقافتی اصلاحات: اگرچہ اکبر باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا، لیکن اس کی فطری ذہانت اور علم دوستی نے اس کی شخصیت کو علم و دانش کا سرپرست بنا دیا۔ وہ خود پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت سے محظوظ ہوتا اور ان کی سرپرستی کرتا۔ اس کا خاص کمال یہ تھا کہ وہ صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ ہندوؤں، جینوں اور عیسائی پادریوں کو بھی یکساں عزت دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں علمی میدان میں بے انتہا ترقی ہوئی، نیز اس کی جانب سے کی گئیں اصلاحات نے ہندوستانی معاشرت اور تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کی خواہش تھی کہ مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے علوم کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے تاکہ باہمی تفہیم اور ہم آہنگی کو فروغ مل

---

[۲۳] ابو الفضل نے اپنی کتاب "آئین اکبری" میں نکاح، اس کی تعداد، مہر، عمر، حسب و نسب، زوجین کی باہمی رضامندی وغیرہ پر اکبر کے نظریات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں اس کے افکار ہندو تہذیب و تمدن سے متاثر تھے۔ ملاحظہ ہو: آئین اکبری، جلد اول، صفحات ۴۱۴-۴۱۶- نیز ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، ص ۵۵۱۔

سکے، چنانچہ اس نے مختلف زبانوں جیسے عربی، فارسی، سنسکرت اور یونانی زبانوں میں موجود مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، مذاہب کے درمیان مکالمے کو ممکن بنایا، ادب و شاعری کو عروج دیا، فنِ تعمیر اور مصوری کو نئی جہت بخشی اور موسیقی کو کثرت میں وحدت کی علامت بنا دیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی علمی و ثقافتی اصلاحات نے ہندوستان میں ایک نئی تہذیب کو جنم دیا، جو نہ صرف اس کے دور میں بلکہ بعد کی صدیوں تک ایک روشن ورثہ کے طور پر قائم رہی۔ اکبر کے عہد میں ہونے والے بعض اہم تراجم میں سنگھاسن بتیسی[۲۴] "نامۂ خرد افزا" (۱۵۷۴)، حیات الحیوان[۲۵] (۱۵۷۵)، اتھر وید[۲۶] (۱۵۷۵)، بائبل[۲۷] (۱۵۷۸)، مہابھارت[۲۸] (رزم نامہ ۱۵۸۲)، بھگوت گیتا اور رامائن[۲۹] (۱۵۸۳)، تزک بابری[۳۰] (۱۵۸۹)، پنچ تنتر[۳۱] (۱۵۹۱)، سرت ساگر (۱۵۹۶) اور آئین اکبری[۳۲] وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اکبر کے دربار کے مشہور شاعر فیضی نے بھی تراجم اور ادبی تصانیف میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سنہ ۱۵۹۴ میں اس نے "نل و دمن" کے عشقیہ قصے کو مثنوی کی شکل میں پیش کیا۔[۳۳] بدایونی کے مطابق ہندوستان میں گزشتہ تین صدیوں میں نظم کی صورت میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ بہر حال یہ تراجم اکبر کی اس پالیسی

---

[۲۴] سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ملا عبد القادر بدایونی نے کیا تھا۔ یہ سنسکرت کی قدیم داستان ہے اور اس کا ہیرو مالوہ کا حاکم راجا بکرماجیت ہے۔ اس کتاب میں بتیس حکایتیں ہیں، ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، جلد دوم، صفحات ۴۲۳-۴۲۴۔

[۲۵] یہ دمیری کی مشہور کتاب ہے اور اس کا فارسی ترجمہ شیخ مبارک علی نے کیا تھا۔

[۲۶] اس کتاب کا فارسی ترجمہ ملا عبد القادر، شیخ فیضی اور حاجی ابراہیم سرہندی وغیرہ نے کیا اور اس کی ترجمانی نو مسلم برہمن بھاون نے کی تھی۔ اکبر نے اس لیے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا تھا کہ اس کے بعض احکام اسلام سے کافی ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۴۴۱۔

[۲۷] ابو الفضل نے اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

[۲۸] مہابھارت کا ترجمہ نقیب خان، ملا عبد القادر بدایونی، ملا شیری اور سلطان حاجی تھانیسری نے مل کر کیا تھا۔

[۲۹] رامائن کا ترجمہ ملا عبد القادر بدایونی نے چار سال میں کیا تھا۔

[۳۰] بابر کی سرگزشت کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ عبد الرحیم خان خانان نے کیا تھا۔

[۳۱] سنسکرت کی مشہور کتاب پنچ تنتر کا فارسی ترجمہ ملا حسین واعظ نے کیا، لیکن وہ کافی مشکل تھا، اس لیے اکبر نے ابو الفضل کو حکم دیا کہ اصل کتاب کو سامنے رکھ کر آسان زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور ترجمہ کی ہوئی کتاب کا نام "عیار دانش" رکھا۔

[۳۲] اس کتاب کے کچھ حصے کا ترجمہ سنسکرت زبان میں پنڈت مہیش نے کیا، اگرچہ وہ اس کا مکمل ترجمہ نہیں کر سکا۔

[۳۳] منتخب التواریخ، جلد دوم، صفحات ق ۵۴۱، ۵۵۴۔

کا عملی مظہر تھے جس کا مقصد مختلف تہذیبوں اور مذاہب کو قریب لا کر ایک ہم آہنگ اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنا تھا۔

اکبر کے دور میں فنونِ لطیفہ بالخصوص فنِ تعمیر، موسیقی، ادب اور مصوری وغیرہ نے غیر معمولی ترقی کی اور یہ صرف شاہی سرپرستی کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس کی اس وسیع النظری کا ثمرہ بھی تھا، جس نے مختلف مذاہب، تہذیبوں اور ثقافتی روایات کو باہم قریب کر دیا۔ ثقافتی سطح پر فنِ تعمیر میں ہندو اور مسلم طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج پیدا ہوا، جیسے فتح پور سیکری کے محلات، جودھا بائی کا محل اور پنچ محل کی عمارتیں مغل تعمیرات میں ہندوانہ سنگ تراشی، جالیوں اور ستونوں کے انداز سے متاثر ہیں، جب کہ ان میں مسلم طرز تعمیر کا گنبد، محراب اور منقش طاقوں کا امتزاج انہیں ایک نئی تہذیبی شناخت بخشتا ہے۔ یہی فنِ تعمیر بعد میں "ہندوستانی مغل طرزِ فنِ تعمیر" کہلایا۔ موسیقی کے میدان میں اکبر نے "نورتن" (نو جواہر) میں شامل تان سین[۳۴] جیسے نابغۂ روزگار موسیقار کی سرپرستی کی۔ اس نے درباری موسیقی میں "دُرگا راگ"، "میان کی مالہار" اور "میواڑی راگ" جیسے نغمے شامل کیے، ان میں ہندو دھرمی راگوں کی روح اور ایرانی طرزِ موسیقی کی نرمی دونوں یکجا تھیں۔ اکبر خود بھی موسیقی کا قدردان تھا۔ وہ اکثر راگ درباری یا راگ دیپک کی محفلوں میں بنفسِ نفیس شریک ہوتا۔ اس طرح موسیقی مذہبی و تہذیبی تفریق سے بالاتر ہو کر روحانی یکجائی کا وسیلہ بنی۔

مصوری کے شعبے میں بھی اکبر نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس نے "تصویر خانہ"[۳۵] قائم کیا، جہاں ایرانی، کشمیری اور ہندو مصور مشترکہ طور پر کام کرتے تھے۔ ان میں بسم اللہ، دولت، منوہر، بسونت، کسو، فرخ بیگ اور عبدالصمد جیسے نام نمایاں ہیں۔ ہندو مصور منوہر اور بسنت نے رامائن، مہابھارت اور پنچ تنتر کے مناظر کو مغلیہ اسلوب میں مصور کیا، جب کہ ایرانی مصوروں نے

---

[۳۴] تان سین ۱۴۹۳ - ۱۵۹۵ کا اصل نام ٹاٹنا سینا یا ٹونا ساٹنا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی پیدائش اٹلی کی تھی، لیکن تاریخ میں ہے کہ اس کی پرورش کشمیر میں ہوئی اور شاید اسی جگہ پیدا ہوا ہو۔ ۱۵۶۷ میں وہ کشمیر سے لاہور آیا اور پھر دہلی چلا گیا۔ یہاں ایک بزرگ ملا سلامت کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا اور پھر ۱۵۶۹ میں پشاور چلا گیا۔ اس کے گانے کی دہلی میں بڑی شہرت تھی۔ وہ پھر داؤد شاہ کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ اس کی شکست کے بعد وہ آگرہ آ گیا اور جلد ہی دربار اکبری سے وابستہ ہو گیا۔ اس کا انتقال ۱۵۹۵ میں ہوا۔ اس نے متعدد راگ اور باجے ایجاد کیے اور پرانے "دیپک راگ" وغیرہ زندہ کیا تھا اور فن موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی۔

[۳۵] ابوالفضل نے اپنی کتاب "آئین اکبری" میں "آئین ۳۵" کے تحت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے، ملاحظہ ہو: آئین اکبری، جلد اول، صفحات ۱۸۳- ۱۹۶۔

رنگوں کی نزاکت، تناسب اور چہرہ نگاری میں نیا ذوق پیدا کیا۔ اکبر کے حکم پر مہابھارت اور رامائن جیسے مذہبی و ادبی متون کی تصویری تدوین کی گئی جو ہندو اساطیر اور اسلامی جمالیات کے امتزاج کی زندہ مثالیں ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عہد میں فنونِ لطیفہ نے مذہبی و تہذیبی اختلافات کو کم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ فن تعمیر کی اینٹوں میں، مصوری کے رنگوں میں، اور موسیقی کے سر و تال میں ہندو اور مسلم روایات اس طرح گھل مل گئیں کہ ہندوستانی تہذیب کو ایک منفرد، ہم آہنگ اور ہمہ گیر شناخت حاصل ہوئی۔

مذہبی اصلاحات: اکبر نے اپنی حکومت کا آغاز ایک روایتی مسلم حکمراں کی حیثیت سے کیا[۳۶]، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے فکری، علمی و مذہبی رجحانات میں غیر معمولی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی۔ اس کی مذہبی پالیسی محض ایک فرد کی ذاتی خواہش یا انفرادیت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے کئی داخلی اور خارجی عوامل کارفرما تھے۔ ہندوستان کی کثیر المذاہب اور کثیر الثقافتی صورت حال، ذاتی مشاہدات اور تجسس، علما کے باہمی اختلافات سے بیزاری، سیاسی تقاضے، ذاتی تجربات، ہندو عورتوں سے شادیاں، مشیرانِ خاص کا اثر اور امن و استحکام کی خواہش، یہ تمام عناصر اس کے مذہبی افکار پر اثر انداز ہوئے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مذہبی رواداری ہندوستان میں امن و سکون اور سلطنت کے استحکام کے لیے ناگزیر ہیں۔[۳۷] اسی مقصد کے تحت اس نے

---

[۳۶] اکبر کی ابتدائی مذہبی زندگی یعنی تقریباً اٹھارہ بیس برس تک انتہائی سادی اور خوش اعتقادی پر مبنی تھی۔ ارکان اسلام کی پابندی، نیز مسجد میں جھاڑو دینا، اذان دینا، علماء، مشائخ اور اہل تصوف کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آنا، ذکر و اذکار کرنا، خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کی زیارت کے لیے پیدل سفر کرنا، فوج کے لیے "یا معین" اور "یا ہادی" کا نعرہ متعین کرنا وغیرہ، اس کی ابتدائی مذہبی زندگی کی مثالیں ہیں۔ اس حوالے سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب "دربار اکبری" میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہو: آزاد، محمد حسین، دربار اکبری، مرتب: سید ممتاز علی، دارالاشاعت، پنجاب، ۱۸۹۸ء، ص ۳۶۔

[۳۷] اس سلسلے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ ۱۵۷۳ میں شیخ مبارک ناگوری نے اکبر سے درخواست کی تھی کہ وہ سیاسی معاملات کی طرح مذہبی معاملات میں بھی عوام کی رہ نمائی کرے، یعنی ایک طرح سے اسے خلیفہ کا کردار ادا کرنے کے لیے کہا جا رہا تھا، لیکن اس وقت اس نے خاموشی اختیار کر لی اور شیخ مبارک کو کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ اس نے اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ اس نے شیخ عبد النبی، ابو الفیض، ابو الفتح، نقیب خاں اور شیخ تاج الدین وغیرہ کے ذریعے کیا۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ ۲۲-۲۶ جون ۱۵۷۹ میں اس کا فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینا اسی سلسلے کی کڑی تھا، کیوں کہ یہ کام اس سے پہلے ہندوستان کے کسی بادشاہ یا سلطان نے نہیں کیا تھا۔ *Rise and Fall of the Mughal Empire,* pp.248-251۔ ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۴۷۶۔

۱۵۷۵ میں فتح پور سیکری میں ایک مخصوص عمارت "عبادت خانہ"[۳۸] کے نام سے قائم کی۔ ابتدا میں یہ صرف صوفیاء اور مسلم علماء کے مکالمے کے لیے مخصوص تھا، لیکن ۱۵۷۸ میں اس نے اس کے دروازے وسیع کر دیے اور اس میں ہندو پنڈتوں، عیسائی پادریوں، جین درویشوں اور پارسی موبدوں کو بھی شامل کیا۔ یہ ایک انوکھا اور بے مثال تجربہ تھا، جس میں مختلف مذاہب کے علماء جمع ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور ایک دوسرے کی بات سنتے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے مابین کشادگی اور افہام و تفہیم پیدا ہو، مشترکہ اخلاقی اصول تلاش کیے جائیں اور انسانیت کو مذہبی تعصبات سے اوپر اٹھ کر دیکھنے کا موقع فراہم کیا جائے، اگرچہ یہ تجربہ ہر پہلو سے کامیاب نہ ہو سکا، کیوں کہ اکثر علماء تلخ مباحثوں میں الجھ جاتے۔ لیکن اس کی اصل اہمیت یہ تھی کہ پہلی مرتبہ ہندوستان میں بین المذاہب مکالمے کو باقاعدہ ایک سرکاری شکل دی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کو صرف ایک مذہب یا طبقے کے لیے نہیں، بلکہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے ایک پر امن اور ہم آہنگ مسکن بنانا چاہتا تھا۔

اکبر کی وسعت نظری اور فکری جستجو کا نمایاں اظہار اس کی "دینِ الٰہی"[۳۹] کی تحریک تھی۔

---

[۳۸] ملا عبد القادر نے اپنی کتاب میں "عبادت خانہ" کی تعمیر، عمارت کی تفصیل، اس میں موجود علماء کے نام اور ان کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ان موضوعات کا بھی احاطہ کیا ہے، جن پر اس میں بحث کی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، جلد دوم، صفحات ۴۳۴-۴۴۱۔ اکبر نے جب محسوس کیا کہ "عبادت خانہ" اپنے اصل مقصد سے ہٹ چکا ہے تو اس نے ۱۵۸۱ میں عملاً مباحث و مجالس کو بند کرنا شروع کیا اور ۱۵۸۲ میں اسے مکمل طور سے بند کر دیا۔ *Rise and Fall of the Mughal Empire*, p.278۔

[۳۹] مؤرخین کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ اکبر نے "دینِ الٰہی" کے نام سے ایک نیا دین ایجاد کیا تھا یا نہیں۔ اس کے درباری مؤرخین، جیسے ملا عبد القادر بدایونی اور ابو الفضل، نے اپنی کتابوں میں "دینِ الٰہی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اس کی جگہ آئین رہ نمونی، ارادہ، مریدی، روش اور اخلاص جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ابو الفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں "آئین ۴۷" میں "رہ نمونی" کے تحت اس کی تفصیلات بیان کی ہیں اور پوری تحریر میں اس نے کہیں بھی "دین الٰہی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: آئین اکبری، جلد اول، صفحات ۳۰۵- ۳۱۰؛ نیز منتخب التواریخ، جلد دوم، صفحات ۲۵۵-۳۳۰۔ بقول شیخ محمد اکرام، اکبری احکام کے لیے "دینِ الٰہی" کی ترکیب پہلی مرتبہ شاید "دبستان مذاہب" میں اکبر کی وفات سے کوئی ساٹھ ستر برس بعد استعمال ہوئی اور اس اصطلاح کو رائج کرنے میں ہنری فرڈیننڈ بلاک مین (Henry Ferdinand Blochmann 1838-1878) کا اہم کردار ہے، اسی نے دانستہ یا غیر دانستہ آئین اکبری کے پہلے انگریزی ایڈیشن میں طریقہ اور روش کا ترجمہ "دینِ الٰہی" سے کیا اور بعد کی درسی کتابوں میں رائج ہو کر مسلمات کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ملاحظہ ہو: رود کوثر، ۲۰۰۵، صفحات ۱۲۷-۱۳۳۔

اس کا خیال تھا کہ جب تمام مذاہب اپنے آپ کو آسمانی ہدایت کا امین قرار دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی اشاعت انبیاء علیہم السلام کے ذریعے ہوئی ہے، تو یقیناً ان میں کچھ مشترکہ اور بنیادی اصول ضرور ہوں گے۔ اس کے نزدیک مذاہب کے اصل مقاصد کم و بیش ایک جیسے تھے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ تفصیلات، بدعات، توہمات اور خود ساختہ رسومات کے پردوں میں دب گئے۔ اگر ان مقاصد کو غیر جانبدارانہ اور عمیق تحقیق کے ذریعے یکجا کر کے سامنے لایا جائے تو یہ انسانیت کو مذہبی اختلافات سے اوپر اٹھا کر ایک وسیع اتحاد کی بنیاد فراہم کر سکتے ہیں۔ اسی سوچ کے تحت اس نے ۱۵۸۲ میں ایک نئے مذہبی فلسفے کی بنیاد رکھی جو بعد میں "دین الٰہی" کے نام سے مشہور ہوا، جو مختلف مذاہب کی اعلیٰ اور مشترکہ اقدار کا نچوڑ تھا۔[۴۰] اس میں بنیادی طور پر سادگی، تقویٰ، سچائی، اخوت و محبت، انصاف اور مساوات پر زور دیا گیا۔ اس فلسفے کے تحت انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کے ساتھ بھی شفقت لازمی قرار دی گئی اور ذبح پر پابندی عائد کی گئی تاکہ ہمدردی اور رحمت کا جذبہ عام ہو۔ اس میں یہ اصول بھی شامل تھا کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آنا ضروری ہے۔ یہ دین عوام میں مقبول نہ ہو سکا اور صرف اٹھارہ قریبی درباریوں نے اسے اختیار کیا، لیکن یہ اکبر کی اس سوچ کا مظہر تھا کہ معاشرے کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم نہیں ہونا چاہیے، بلکہ انہیں ایک مشترکہ اخلاقی ضابطے کے تحت امن اور محبت کے ساتھ رہنا چاہیے۔

اکبر کی مذہبی اصلاحات میں ایک نمایاں پہلو مذہبی آزادی تھا۔ وہ خود اگرچہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کے حق میں نہیں تھا، لیکن اس نے ۱۶۰۱ میں اعلان کیا کہ ہر شخص اپنے مذہب کے سلسلے میں آزاد ہے۔ کوئی فرد یا ادارہ کسی دوسرے کو زبردستی یا لالچ دے کر

---

[۴۰] بقول شیخ محمد اکرام، یہ ایک مذہب نہیں تھا، ارادت و عقیدت کا سلسلہ تھا، جس کی بنیاد ماننے والوں کی کمزوریوں یعنی طمع اور خوشامد اور رائج کرنے والے کی خود فریبی و خود پسندی پر قائم تھی، ملاحظہ ہو: رود کوثر، ص ۱۲۹۔ اس میں زکوۃ اور جزیہ ختم کر دیا گیا، شراب، جوا، سور اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں جائز قرار دی گئیں۔ سن ہجری، گائے کا ذبیحہ، اذان، عربی زبان، کزن سے شادی وغیرہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سجدۂ تعظیمی کو رواج دیا گیا اور اسلام کے بنیادی عقائد کا انکار کر دیا گیا، جو ظاہر ہے کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کے برخلاف ہے۔ اس موضوع پر ملا عبد القادر بدایونی، شیخ احمد سرہندی، ابو الکلام آزاد اور محمد اسلم وغیرہ نے اپنی تحریروں میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں خود اس کی مثال موجود ہے، اس نے جب راجہ مان سنگھ کو دین الٰہی کی طرف راغب کرنا چاہا تو اس نے بادشاہ کو جواب دیا کہ اگر اس سے مراد جاں نثاری ہے تو میں تو ہر موقع پر اپنی جان ہتھیلی پر لیے حاضر رہا ہوں، پھر امتحان لینے کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور منشا ہے اور اس کا تعلق مذہب سے ہے تو میں ہندو ہوں، اگر آپ کہیں تو میں مسلمان ہو جاؤں، میں ان دونوں راستوں کے علاوہ کسی اور راستے پر نہیں چلنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر اکبر نہ تو ناراض ہوا اور نہ ہی کوئی سخت حکم دیا، بلکہ وہ خاموش ہو گیا۔[۴۱] اسی طرح اکبر نے ایک بار کہا:

> ہم پہلے بہت سے آدمیوں کو جبراً اپنے مذہب میں لاتے تھے اور اسی کو اسلام سمجھتے تھے، مگر جب سمجھے تو ہم اپنی اس حرکت سے شرمندہ ہوئے کہ ہم خود تو مسلمان نہیں اور دوسروں کو اپنے جیسا اسلام سکھاتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے اور دوسرے یہ کہ زبردستی کا اسلام، کیسا اسلام ہے۔"[۴۲]

دینِ الٰہی کو نہ صرف مسلم امراء، بالخصوص قطب الدین محمد خاں اور شہباز خاں کے علاوہ متعدد علماء نے تنقید کا نشانہ بنایا، بلکہ اس کے خلاف مسلمانوں کے ساتھ ساتھ باشعور اور دیانت دار ہندو زعماء کی جانب سے بھی آواز بلند ہوئی۔ اکبر نے اس نئے مذہبی فلسفے کو کسی مخصوص طبقے پر مسلط نہیں کیا، تاہم اس کے نظریاتی خدوخال سے مختلف حلقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ راجپوت راجاؤں نے، جو اکبر کے سب سے قریبی سیاسی حلیف تھے، اس نئے مذہب یا طریقۂ زندگی کو اپنانے سے واضح انکار کیا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو مذہب کے معاملے میں اگرچہ زیادہ گہرائی نہیں رکھتا تھا، لیکن اپنی روایات اور عقائد کے حوالے سے نہایت حساس تھا۔ جب اکبر نے راجپوت امراء سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو راجا بھگوان داس نے سب سے زیادہ مخالفت کی اور انہوں نے نہایت متانت اور بصیرت کے ساتھ کہا کہ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہندومت اور اسلام، دونوں میں بعض خامیاں ضرور پائی جاتی ہیں، مگر یہ بتایئے کہ ان دونوں سے بہتر ایسا

---

[۴۱] منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۳۳۵۔

[۴۲] دراصل مولوی عبدالباری نے آئین اکبری سے اکبر کے متعدد اقوال جمع کیے ہیں۔ یہ اسی سے ماخوذ ہے، ملاحظہ ہو: مولوی عبدالباری، اقوال اکبر، صدیق بک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ، سن اشاعت غیر مذکورہ، ص ۱۴۔

کون سا فرقہ یا دین ہے جسے ہم بلا تردد قبول کر سکیں؟[۴۳] اکبر نے راجا بھگوان داس کی اس بات کو خاموشی سے سنا اور اس پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اس کی رائے کو تحمل سے قبول کیا، جو اس کی فکری وسعت اور رواداری کی ایک اور روشن مثال ہے۔

تجزیاتی مطالعہ: جلال الدین محمد اکبر نے اپنے عہد کی متنوع سیاسی، مذہبی اور سماجی پیچیدگیوں کے درمیان صلحِ کل اور بین المذاہب ہم آہنگی کو عملی صورت دینے کی کوشش کی۔ اس کی بعض پالیسیوں کے پسِ پردہ بلاشبہ سیاسی و انتظامی مصلحتیں کارفرما تھیں، تاہم اس کی وسیع النظری اور عدل پسندی نے مذہبی ہم آہنگی کے لیے ایک ایسا فکری ماحول پیدا کیا جس کی بنیاد سماجی و معاشی مساوات اور انصاف پر استوار تھی۔ اس نے مالی اور سماجی اصلاحات کے ذریعے وہ بنیادیں رکھیں جو طویل المدت سطح پر اثر انداز ہوئیں اور ہندوستانی معاشرت کو ایک متحدہ سمت عطا کی۔ اگر اسے اپنے معاصر حکمرانوں مثلاً شیر شاہ سوری یا مہارانا پرتاپ کے مقابلے میں دیکھا جائے تو اس کی پالیسیوں کی نوعیت، وسعت اور اثر پذیری نمایاں نظر آتی ہے۔ اس نے اقتدار کو صرف فتوحات کا ذریعہ نہیں بلکہ معاشرتی ہم آہنگی کے فروغ کا وسیلہ بنایا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے کئی فکری و نظری منصوبے درباری سطح سے عوامی سطح تک منتقل نہ ہو سکے کیوں کہ عوامی قبولیت کے بغیر کوئی بھی نظریہ دیرپا ثابت نہیں ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پالیسیوں نے وقتی طور پر سیاسی استحکام اور امن فراہم تو کیا، لیکن ان کی اصل اہمیت ان کے فکری اثرات میں مضمر ہے، جو بعد میں صدیوں تک ہندوستان کی سیاسی و فکری تاریخ کو متاثر کرتے رہے۔

قدیم و جدید مؤرخین اور علما کی ایک بڑی تعداد نے اکبر کے سیاسی، سماجی، معاشی، علمی اور بالخصوص مذہبی نظریات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں بعض نے اسے ایک عظیم مصلح، مدبر حکمراں اور انسانیت کا علمبردار قرار دیا، جب کہ دوسرے علماء اور محققین نے اس کے اقدامات کو اسلام سے انحراف اور سیاسی ضرورت کا نتیجہ بتایا۔ ابتدائی معاصر مؤرخین میں ملا عبدالقادر بدایونی (۱۵۴۰-۱۶۱۵)، ابوالفضل (۱۵۵۱-۱۶۰۲)، فیضی (۱۵۴۷-۱۵۹۵) اور شیخ احمد سرہندی

---

[۴۳] منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۳۱۳۔

(۱۵۶۴-۱۶۲۴)[۴۴] کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے بعد شیخ محمد اکرام (۱۹۰۸-۱۹۷۳)، شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴)، مولانا ابوالکلام آزاد[۴۵] (۱۸۸۸-۱۹۵۸)، مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی[۴۶]، سید ابوالحسن علی ندوی[۴۷] (۱۹۱۳-۱۹۹۹) اور مولانا مناظر احسن گیلانی[۴۸] (۱۸۹۱-۱۹۵۶) نے اکبر کی شخصیت اور پالیسیوں کو مختلف فکری و مذہبی زاویوں سے پرکھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو[۴۹] (۱۸۸۹-۱۹۶۴) نے بھی اکبر کے کردار کو ہندوستانی قومیت کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ جدید عہد میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (۱۹۰۳-۱۹۸۱)[۵۰]، خلیق احمد نظامی (۱۹۲۵-۱۹۹۷)[۵۱]، عرفان حبیب (۱۹۳۱)، ڈاکٹر محمد یاسین[۵۲]، سید صباح الدین عبدالرحمن (۱۹۱۹-۱۹۹۳)،

---

[۴۴] مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، مترجم: شاہ، سید زوار حسین، ادارہ مجددیہ، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۸، مکتوب ۴۶-۴۷-۸۱۔

[۴۵] مولانا آزاد نے اپنی کتاب "تذکرہ" میں حضرت شیخ جمال الدین دہلویؒ کے تحت اکبر اور اس کے دین الٰہی کا ضمناً تذکرہ کیا ہے، ملاحظہ ہو: ابوالکلام آزاد، تذکرہ، مرتب: مالک رام، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹۸۵، صفحات ۳۳-۴۳۔

[۴۶] کوٹلوی، مہر محمد خاں شہاب مالیر، دین الٰہی اور اس کا پس منظر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۴۔

[۴۷] ندوی، سید ابوالحسن علی، تاریخ دعوت و عزیمت، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، جلد چہارم، صفحات ۶۵-۱۳۲۔

[۴۸] مولانا گیلانی نے اپنے مضمون "ہزارہ دوم یا الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" میں اکبر کے دین الٰہی کو "ہندوستان کا فتنۂ کبریٰ" سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: نعمانی، محمد منظور، تذکرہ مجدد الف ثانی، الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ، ۱۹۹۲، صفحات ۲۵-۱۰۲۔

[۴۹] پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب *The Discovery of India* میں اکبر کی مذہبی خدمات کا مثبت جائزہ لیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Nehru: Jawahar Lal, *The Discovery of India,* Oxford University Press, Delhi, 1989

[۵۰] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی دو کتابوں میں اس حوالے سے گفتگو کی ہے: Quraishi, Ishtiaq Husain, The Muslim Community of The Indo-Pakistan Subcontinent (610-1947), A Brief Historical Analysis, Mouton & Co., The Hague, 1962 & Quraishi, Ishtiaq Husain, Ulema in Politics, Renaissance Publishing House, Jitar Nagar, Delhi.

[۵۱] خلیق احمد نظامی نے دین الٰہی کا تفصیلی جائزہ اپنی کتاب "اکبر اور مذہب" میں لیا ہے، ملاحظہ ہو: Nizami, Khaliq Ahmad, *Akbar & Religion,* Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi, Delhi, 2009

[۵۲] محمد یاسین، ہندوستان کے عہد مغلیہ کی سماجی تاریخ، مترجم: بدایونی، اے اے ہاشمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸۔

احمد بشیر (۱۹۲۳-۲۰۰۴)، محمد اسلم[۵۳]، مکھن لال رائے چودھری[۵۴] اور مبارک علی (۱۹۴۱)[۵۵] جیسے مؤرخین نے اکبر کے عہد کو تاریخی و فکری تجزیے کے ساتھ پیش کیا۔ ان میں سے بعض، مثلاً ابوالفضل، فیضی، ابوالکلام آزاد، نہرو، محمد یاسین، خلیق احمد نظامی، مبارک علی اور شیخ محمد اکرام اکبر کو ایک روشن خیال، روادار اور ہمہ گیر حکمراں تصور کرتے ہیں۔ دوسری طرف بدایونی، شیخ احمد سرہندی، اشتیاق حسین قریشی، احمد بشیر، عرفان حبیب اور شبلی نعمانی جیسے ناقدین کا خیال ہے کہ اکبر کی اصلاحات مذہبی عقیدے سے زیادہ سیاسی مصلحت پر مبنی تھیں۔ ان کے نزدیک "عبادت خانہ" اور "دینِ الٰہی" جیسے اقدامات دراصل اقتدار کے استحکام اور مذہبی اختیارات کو محدود کرنے کی کوششیں تھیں، جو آخرکار فکری وحدت کے بجائے الجھن اور تفرقے کا باعث بنیں۔ اس طرح سے اکبر کی مذہبی پالیسی پر تاریخی آراء دو واضح دھاروں میں تقسیم ہو جاتی ہیں: ایک وہ طبقہ جو اسے روحانی وسعتِ نظر، اخلاقی بصیرت اور انسان دوستی کی علامت سمجھتا ہے، اور دوسرا وہ جو اسے مذہبی انحراف، سیاسی تدبیر اور اقتدار کی چال قرار دیتا ہے۔

اگر معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اکبر کی پالیسیوں میں مثبت اور منفی دونوں پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور علمی کاوشوں نے بلاشبہ ہندوستانی معاشرت کو امن، رواداری اور باہمی ہم آہنگی کی فضا فراہم کی، نیز اس نے مختلف مذہبی اور سماجی طبقات کو ایک وسیع سیاسی چھت کے نیچے جمع کیا اور اس تنوع کو ٹکراؤ کے بجائے تعاون میں بدلنے کی کوشش کی۔ تاہم اس کی بعض پالیسیوں کی مذہبی بنیاد نسبتاً کمزور اور غیر ضروری تھی، اسی لیے وہ پائیدار اور عوامی سطح پر قابلِ قبول نہ ہو سکیں۔ مثال کے طور پر دینِ الٰہی، جسے اکبر نے بین المذاہب اتحاد کے فلسفے کے طور پر پیش کیا، نظریاتی طور پر بلند، لیکن عملی لحاظ سے محدود ثابت ہوا۔ یہ تجربہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کو کسی نئے مذہب یا نظریے کے ذریعے

---

[۵۳] محمد اسلم، دین الٰہی اور اس کا پس منظر، ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، ۱۹۶۹۔

[۵۴] Roy Choudhury, Makhan Lal, The Din-i-Ilahi or The Religion of Akbar, University of Calcutta, 1941

[۵۵] مبارک علی نے اس موضوع پر اپنی متعدد تحریروں میں اظہار خیال کیا ہے، ملاحظہ ہو: علی، مبارک، علماء اور سیاست، فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور، سن اشاعت غیر مذکور؛ ہندوستان کی کہانی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۹

زبردستی قائم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے فکری برداشت، دل کی وسعت اور باہمی احترام ضروری عناصر ہیں، اس حوالے سے اسلامی تاریخ میں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ پروفیسر کالی کرنجن قانون گو نے اس سلسلے میں تجزیہ کیا ہے:

> اکبر کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی اور معاشرتی اتحاد پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کی، نیز اس نے عدل و انصاف پر مبنی ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کی جس میں ہندوستان کے سیاسی اور معاشی استحکام کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سلسلے میں اس نے کسی بھی قسم کی جلد بازی سے گریز کیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ قوم سازی ایک تدریجی عمل ہے۔ تاہم اس کی یہ نیک نیتی بالآخر اس کے لیے اس وقت نقصان دہ ثابت ہوئی جب اس نے خود کو محض ایک سیاسی حکمراں کے بجائے ایک مذہبی رہ نما کے طور پر پیش کیا اور "دینِ الٰہی" کے ذریعے ایک نئی روحانی تحریک برپا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں نفاق اور ہندوؤں میں غلامانہ عقیدت نے جنم لیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کچھ ہندو مفکرین نے "اللہ اپنشد" جیسی تحریریں لکھ کر اپنے بادشاہ کو روحانی مرتبہ دینے کی کوشش کی اور بعض نے بادشاہ کے "درشن" کے بغیر پانی پینا بھی گناہ سمجھا۔ اس کی یہ بڑی غلطی تھی کہ اس نے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی مذہبی ساکھ کو کمزور کر دیا۔ اگر وہ اپنی ذاتی زندگی میں زیادہ متشرع مسلمان رہتا، تو وہ ہندوؤں کے لیے رعایتیں دینے کا جواز اپنے ہم مذہبوں کے سامنے زیادہ مؤثر انداز میں پیش کر سکتا تھا۔ مگر اس کے طرزِ عمل نے مسلمانوں میں بدگمانی پیدا کی اور انہوں نے اس کے ہر اقدام کو اسلام سے انحراف سمجھا۔ یوں اکبر کی قوم سازی اور اتحاد کی کوشش اپنے ہی مذہبی حلقے کی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ (۵۶)

بہر حال ہندوستان جو مذہبی، لسانی اور نسلی تنوع سے لبریز ہے، اسی وقت پائیدار امن حاصل کر سکتا ہے جب برداشت، رواداری، مساوی حقوق اور باہمی احترام کو سماجی اصولوں کی حیثیت دی جائے اور اختلافِ عقیدہ کے باوجود ایک دوسرے کے احترام کو اپنی شناخت کا حصہ بنایا جائے۔

---

(۵۶) Qanungo, Kalikaranjan, *Sher Shah: A Critical Study Based on Original Sources*, Kar. Majumder & Co., Calcutta, 1921, pp. 420-424

عربی ناول نگاری میں سیرت النبی ﷺ کا ارتقاء

کفیل احمد بٹ (ریسرچ اسکالر)
پروفیسر ارشاد احمد میر
اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر

آج تک کسی بھی امت کے لوگوں نے اپنے قائد کی زندگی کے لیے ادب کی دنیا میں اتنا اہتمام نہیں کیا جتنا اہتمام امت مسلمہ نے اپنے رہنما محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں کتابیں اس عظیم ہستی کی مبارک زندگی کے متعلق آج تک مختلف ادبی فنون میں شائع ہوئی ہیں اور دن بہ دن اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

سیرت نگاری کا فن مستقل طور پر الگ سے وجود میں آنے سے پہلے سیرت النبی ﷺ صحابہ و تابعین کے سینوں میں محفوظ رہی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وہ اسے اپنی اولاد اور شاگردوں کے سامنے بیان کرنے لگے۔ پھر ان شاگردوں نے بھی اس کے ساتھ خصوصی توجہ کا اہتمام کیا جیسا کہ ان کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کی سب سے مستند دلیل علی بن حسین بن علی رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''ہم (اپنے شاگردوں کو) نبی ﷺ کی سیرت طیبہ اس طرح سکھاتے تھے جیسے کہ ہم (انہیں) قرآن مجید کی کوئی سورت سکھاتے تھے''۔[1]

اسی طرح اسماعیل بن محمد بن سعد بن ابی وقاص سے یہ قول ثابت ہے کہ انہوں نے کہا:

> ''میرے والد ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ پڑھاتے تھے اور اسے ہم پر دہراتے تھے اور پھر ہمیں نصیحت کے طور پر کہتے تھے کہ یہ تمہارے آباء و اجداد کی وراثت ہے اسے ضائع نہ کرنا''۔[2]

تابعین کے بعد سیرت نگاری کا فن مستقلاً وجود میں آیا۔ محمد بن اسحاق (۱۵۲ھ) وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ''السیر والمغازی'' کے نام سے سب سے پہلی کتاب سیرت النبی ﷺ کے حوالے

---

[1] ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ، قطر-الدوحۃ، ۲۰۱۵م، ج۳، ص ۴۲۴۔

[2] خطیب بغدادی الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع، مکتبۃ المعارف، ریاض-سعودی عربیہ، ۱۹۸۳م، ج ۲، ص ۱۹۵۔

سے لکھی۔

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ جو کچھ ابن اسحاق نے لکھا اسی میں سے عبد الملک ابن ہشام (۲۱۳ھ) نے بعض تفاصیل داخل کیں اور بعض عبارات کو حذف کر کے "سیرت ابن ہشام" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو کہ آج بھی مختلف مکتبوں سے شائع ہوتی ہے۔ اس کے بعد سینکڑوں کی تعداد میں علماء اور ادباء نے سیرت نگاری کے فن پر مختلف ادبی فنون میں کام کیا۔

سیرت النبی ﷺ اور عربی ناول نگاری: جدید عربی ناول نگاری میں سیرت کا موضوع اسی دن سے قابل توجہ رہا جب سے عربی میں ناول نگاری کا فن وجود میں آیا یعنی بیسویں صدی میلادی سے۔

طہ حسین وہ پہلے عربی ادیب ہیں جنہوں نے سیرت النبی ﷺ کے مضمون کو عربی ناول نگاری میں اختیار کیا اور "علی ھامش السیرۃ" کے نام سے ایک ناول تین جلدوں میں ۱۹۳۳، ۱۹۳۷ اور ۱۹۴۶ میں شائع کیا۔ اس کی تالیف کے سبب کے بارے میں طہ حسین کتاب کے مقدمے لکھتے ہیں: "اگر یہ کتاب نوجوانوں کے دلوں میں یہ بات ڈالنے میں کامیاب ہو جائے کہ پرانے ادبی شہ پاروں کو ضروری نہیں کہ اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ وہ پرانا ہے اور اسی طرح نئے ادبی پاروں کو اس لئے اختیار کیا جائے کہ وہ نیا ہے بلکہ پرانے ادب کو تب چھوڑا جائے جب وہ نفع و فائدے سے خالی ہو اور اگر وہ نفع بخش ہو تو لوگ اس کے لیے نئے ادبی پاروں سے کم ضرورت مند نہیں ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کیونکہ میں یہی چاہتا ہوں"[۳]۔

طہ حسین نے اس ناول کو لکھنے میں قدیم ادبی ذخیروں کو مصدر کے طور پر استعمال کیا ہے جن میں سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری وغیرہ قابل ذکر ہیں کیونکہ وہ ان ادباء میں شامل تھے جو نئے ادبی شہ پاروں کو پرانے ادب کی حفاظت کے ساتھ آگے بڑھانا چاہتے تھے۔

پھر توفیق الحکیم نے "محمد الرسول البشر" کے نام سے ایک ڈرامائی ناول لکھا جس کو انہوں نے ۱۹۳۶م میں شائع کیا۔ اس ناول میں ناول نگار نے صحیح احادیث اور مستند کتابوں پر اکتفاء کیا ہے جیسا کہ توفیق الحکیم نے خود ہی اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "سیرت کی کتابوں میں عموماً یہی رجحان پایا جاتا ہے کہ اسے کاتب تفصیلی یا تحلیلی یا دفاعی یا تنقیدی اسلوب میں مرتب کرے

[۳] طہ حسین، علی ھامش السیرۃ، مؤسسۃ ھنداوی للتعلیم والثقافۃ، قاہرہ ۲۰۱۲م، ص ۱۰۔

لیکن میں نے اس کتاب کو لکھنے سے پہلے اپنے آپ سے یہ سوال کیا کہ کس حد تک ناول نگار اس روایتی اسلوب کو اختیار کر سکتا ہے تاکہ سیرت بیان کرنے میں اس کی کوئی ذاتی مداخلت شامل نہ ہو، تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ناول نگار کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ مداخلت سے بچ سکے۔ پھر میرے دل میں یہ رائے جم گئی کہ میں اسی طرز پر سیرت النبی ﷺ لکھوں گا"[۴]۔

اس کے بعد عباس محمود العقاد نے اس فن میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے "عبقریۃ محمد ﷺ" کے نام سے ایک ناول ۱۹۴۳ میں شائع کیا۔ اس ناول کے مقدمے میں ہی ناول نگار نے مستشرقین کے حوالے سے یہ بات واضح کی ہے کہ ہم ان سے مدد لئے بغیر ہی نبی ﷺ کی ذات اور اسلام کو سمجھ سکتے ہیں لہٰذا ہمیں ان کی اس باب میں کوئی ضرورت نہیں۔ اس بارے میں ان کے الفاظ یہ ہیں: "ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم تھامس کارلائل کی ان تعریفوں پر دھیان رکھتے ہیں جو اس نے نبی ﷺ کے بارے میں بیان کیں حالانکہ وہ ایک مغربی ادیب ہے جو نبی ﷺ کو اس طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح ہم نبی ﷺ کو سمجھ سکتے ہیں اور اسی طرح وہ اسلام کو بھی اس طرح نہیں جانتا جس طرح ہم اسے جانتے ہیں"[۵]۔

عقاد نے اس کتاب کے ہر باب میں ان مغربی ادباء کا تعاقب کیا ہے جنہوں نے نبی ﷺ کی شخصیت کو داغدار کرنے کی ناکام کوششیں کیں اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ نبی ﷺ کی اعلیٰ شخصیت ان کمزوریوں اور نقائص سے بالاتر و ارفع ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے خاص کر دو فصلوں کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ ایک نبی ﷺ کی جنگوں کے متعلق نظریہ اور دوسرا آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی کیونکہ یہ دو مسائل اہل مغرب نے زیادہ اُچھالے ہیں۔

اس کتاب کو مرتب کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تمام لوگوں کے دلوں میں نبی ﷺ کی تعظیم داخل کی جائے نہ کہ صرف مسلمانوں کے دلوں میں، کیونکہ آپ ﷺ تمام لوگوں کے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔

ان ادباء کے بعد عبد الرحمٰن شرقاوی نے اس فن کو مزید آگے بڑھایا اور انہوں نے "محمد رسول الحریۃ" کے نام سے ۱۹۶۲م میں ایک ناول شائع کیا۔ اس ناول کے ذریعے ناول نگار

---

[۴] توفیق الحکیم، محمد ﷺ الرسول البشر، دار الھلال- قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷م، ص ۱۱۔

[۵] عباس محمود العقاد، عبقریۃ محمد ﷺ، الناشر مؤسسۃ ھنداوی- قاہرہ، ۲۰۱۷م، ص ۴۔

ہمیں اس بات سے آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ نبی ﷺ کی شخصیت ان تمام اوصاف سے متصف ہے جو ایک انسان کامل میں موجود ہونی چاہئیں۔ اس میں ادیب نے بھرپور کوشش کی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ایک ایسی عظیم شخصیت ہے جو ذاتی طور پر لوگوں کے مصائب سمجھتی ہے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اس بات کی عکاسی انہوں نے اپنے مقدمے میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”میں سیرت کے عنوان پر کوئی نئی کتاب نہیں لکھ رہا ہوں۔ سیرت کا مکتبہ تو پرانی اور نئی بے شمار کتابوں سے بھرا پڑا ہے جو اسے اس چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے کہ اسے میری حاجت ہو۔ لیکن میں صرف اس ارادے سے لکھ رہا ہوں تاکہ میں ایک ایسے انسان کی تصویر کشی کر سکوں جو انسانی مصائب اور مشکلات کو اپنے دل میں سمانے کی طاقت رکھتا ہو اور اس کی تعلیمات ایک ایسا مہذب اور تابناک تمدن پیش کرتی ہیں جو تمام عالم کو ہزاروں سال تک باقی تعلیمات سے بے نیاز کر دیتا ہے“[۶]۔

یوں وہ اسلام کی تابناک تاریخ اور اس کی روشن شخصیات کا ذکر اس صورت میں کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دنیا کو بتا سکیں کہ یہ سب نبی ﷺ کی تعلیمات کا ہی نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے لکھنے کا ایک اور مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ نبی ﷺ کی سیرت صرف مسلمانوں کی وراثت نہیں بلکہ دنیا کے تمام لوگ اس کے حقدار ہیں۔ وہ اس بات پر بھی لوگوں کو ابھارتے ہیں کہ ہمیں ایسی سینکڑوں کتابوں کی ضرورت ہے جو مسلم اور غیر مسلم دونوں پڑھ سکیں اور ان سے استفادہ کر سکیں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے نبی ﷺ میں وہ تمام اوصاف اتم موجود ہیں جو اسے انسانیت کے لیے اسوۂ کاملہ بناتی ہیں نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے۔

اس بات کی طرف مؤلف نے ان الفاظ سے توجہ دلائی ہے: ”ہمیں دین کے بارے میں ایسی کسی بھی کتاب کی ضرورت نہیں جسے صرف مسلمان پڑھ سکے بلکہ ہمیں ایسی سینکڑوں کتابوں کی ضرورت ہے جو اس ترقی اور تطور کی عکاسی کرتی ہوں جسے مسلم اور غیر مسلم دونوں پڑھ سکیں اور جو ہماری میراث کے مثبت عناصر کو بیان کر سکیں اور نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں موجود انسانی اوصاف کی ترجمانی کر سکیں“[۷]۔

---

[۶] عبد الرحمٰن الشرقاوی، محمد رسول الحریۃ، دار الشروق ۱۹۹۰م، قاہرہ، ص۹۔

[۷] ماخذ سابق، ص۱۰، ۱۱۔

پھر ایک اور مصری ادیب نجیب کیلانی نے اس فن میں طبع آزمائی کی اور "نور اللہ" کے نام سے دو جلدوں میں ایک ناول لکھا اور ۱۹۶۸م میں اسے پہلی مرتبہ شائع کیا۔ یہ ناول مؤلف کے مشہور ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں مؤلف نے سب سے پہلے اس بات پر بحث کی ہے کہ مجرد تاریخ اور ناول لکھنے میں کیا فرق ہے؟ پھر یہ بتایا ہے کہ ناول ایک خاص قالب میں لکھنا پڑتا ہے جبکہ تاریخ ان قیود سے آزاد ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے جو ایک ناول نگار کو اس وقت درپیش ہوتی ہیں جب وہ خود مسلم ہو اور نبی ﷺ جیسی عظیم شخصیت پر بات کرنے جارہا ہو کیونکہ ایسی شخصیات اس بات کا پورا حق رکھتی ہیں کہ ان کا احترام برقرار رکھا جائے لہذا ان کی طرف ایسے اقوال منسوب نہ کیے جائیں جو ان کے وقار کے خلاف ہوں اور ان پر جھوٹ باندھنے کے مترادف بھی۔

اس کے بعد انہوں نے اس فرق کو بھی بیان کیا جو ایک مسلم ناول نگار کو ایک غیر مسلم ناول نگار سے الگ کرتا ہے کیونکہ غیر مسلم ناول نگار اپنی ان خاص آراء کو بیان کرتا ہے جو اس کے ذہن میں پنپ رہی ہوتی ہیں، لیکن مسلم ناول نگار اپنے دین کے اعتبار سے ان قیود کا پابند ہوتا ہے جو اس کی دینی شخصیت کو قائم رکھتے ہیں۔ اس ناول میں مؤلف نے یہود، مشرکین مکہ اور منافقین کی اسلام اور پیغمبر اسلام کے تئیں عداوت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے اس میں نبی ﷺ کی سیرت طیبہ کا بعثت سے فتح مکہ تک ذکر کیا ہے اور باقی اجزاء کو کسی اور کتاب میں بیان کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے بعد نجیب محفوظ نے، جو کہ مصر کے مشہور ادباء میں شمار ہوتے ہیں، سیرت النبی ﷺ پر ایک رمزیہ ناول لکھا اور اس کا نام "اولاد حارتنا" رکھا۔ اس کو انہوں نے پہلے الاہرام اخبار میں شائع کیا لیکن ادباء نے اسے ہدف تنقید بنایا جس کی وجہ سے وہ مصر میں کتابی شکل میں شائع نہیں ہو سکا۔ پھر اسے بیروت کے ادارے دار آداب سے ۱۹۶۲م میں شائع کیا۔ بعد میں جب مصر میں حالات سازگار ہوئے تو وہاں سے بھی ۲۰۰۶م میں اسے شائع کیا گیا۔

پھر ایک اور مصری ادیب عبد الحمید جودہ السحار نے اس موضوع پر عربی ناول نگاری کا سب سے طویل ناول رقم کیا اور اس کا نام "محمد رسول اللہ والذین معہ" رکھا۔ یہ کتاب بیس جلدوں میں مکتبہ مصر سے شائع ہوئی۔ ان بیس جلدوں کے نام حسب ذیل ہیں: ۱-ابراہیم ابو الانبیاء، ۲-ھاجر مصریۃ ام العرب، ۳-بنو اسماعیل، ۴-عدنانیون، ۵-قریش، ۶-مولد رسول، ۷-یتیم، ۸-خدیجہ بنت خویلد،

۹-دعاء ابراہیم، ۱۰-عام الحزن، ۱۱-ہجرت، ۱۲-غزوہ بدر، ۱۳-غزوہ احد، ۱۴-غزوہ خندق، ۱۵-صلح حدیبیہ، ۱۶-فتح مکہ، ۱۷-غزوہ تبوک، ۱۸-عام الوفود، ۱۹-حجۃ الوداع، ۲۰-وفات رسول۔

آخر میں جزیرۂ عرب سے تعلق رکھنے والے ادیب محمد بن حمد صویانی نے اس موضوع کو اپنے قلم کا مرکز بنا کر چار جلدوں پر مشتمل ایک طویل ناول "السیرۃ النبویۃ کما جاءت فی الأحادیث الصحیحۃ" کے نام سے مکتبہ عبیکان سے شائع کیا۔ مؤلف نے اس ناول کو آسان زبان میں لکھا ہے تاکہ ہر کوئی اس سے استفادہ کر سکے۔ وہ خود لکھتے ہیں: "میں نے سیرت کے واقعات کو آسان بنانے کی بھرپور کوشش کی تاکہ اس سے وہ تمام لوگ استفادہ کر سکیں جو تعقیدات کو نہیں ڈھونڈنا چاہتے ہے۔ اس لئے میں نے صحیح احادیث کو زمانے کی ترتیب کے ساتھ بیان کیا تاکہ یہ صرف واقعات کا نقل ہی ثابت نہ ہو بلکہ ایک قصے کے انداز میں ظاہر ہو"[۸]۔

مؤلف نے نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ کو ولادت سے لے کر آپ ﷺ کے اس دنیائے فانی سے دار القرار کی طرف جانے تک بیان کیا ہے۔ اس میں مؤلف نے نبی ﷺ کے اعلیٰ اخلاق اور شریعت اسلامیہ کے احکام کو اس طرح بیان کیا تاکہ دنیا کو یہ بات ذہن نشین ہو کہ اسلام اور پیغمبر اسلام دونوں قابل عمل ہیں اور انسانیت کے حقوق کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مصادر و مراجع

۱. ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیۃ، قطر-الدوحۃ، ۲۰۱۵۔
۲. خطیب بغدادی، الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع، مکتبۃ المعارف، ریاض-سعودی عربیہ، ۱۹۸۳م۔
۳. محمد بن حمد الصویانی، لسیرۃ النبویۃ کما جاءت فی الاحادیث الصحیحۃ، مکتبۃ العبیکان، ریاض-سعودی عربیہ، ۱۴۲۴ھ۔
۴. نجیب محفوظ، اولاد حارتنا، دار الشروق، قاہرہ، ۲۰۱۷م۔
۵. طہ حسین، علی ھامش السیرۃ، مؤسسۃ الھنداوی للتعلیم والثقافۃ، قاہرہ، ۲۰۱۲م۔
۶. عبد الرحمن الشرقاوی، محمد رسول الحریۃ، دار الشروق، قاہرہ، ۱۹۹۰م۔
۷. عباس محمود العقاد، عبقریۃ محمد، الناشر مؤسسۃ الھنداوی، قاہرہ، ۲۰۱۷م۔
۸. توفیق الحکیم، محمد الرسول البشر، دار الھلال، قاہرہ، ۱۹۵۷م۔
۹. عبد الحمید جودہ السحار، محمد رسول اللہ والذین معہ، دار مصر للطباعۃ، قاہرہ۔
۱۰. نجیب کیلانی، نور اللہ، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۳م۔

[۸] السیرۃ النبویۃ کما جاءت فی الاحادیث الصحیحۃ، محمد بن حمد الصویانی، مکتبۃ العبیکان، ص۸۔

مولانا ابو الکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ کے تعلقات: "غبار خاطر" کے آئینے میں

ادیبہ صدیقی
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
adeebasiddiqui94.amu@gmail.com

"غبار خاطر"(۱۹۴۶ء) اور" کاروان خیال"(۱۹۴۶ء) اردو زبان وادب کے وہ بیش قیمت نگار خانے ہیں جہاں ایک ہی عہد کی دو مایہ ناز شخصیت اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ ایک طرف نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (۱۸۶۷-۱۹۵۰ء) جیسی نابغۂ روزگار شخصیت ہے۔ جن کی علم دوستی اور علم پروری ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنالیا کرتی تھی وہیں دوسری طرف امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد(۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) جیسی عبقری شخصیت ہے۔ جنہیں قدرت نے فکر و عمل اور قوت اظہار و بیان کی غیر معمولی اور ہمہ جہت صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

مولانا آزاد کا شمار برصغیر ہند و پاک کی نامور ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ عظیم مفکر منفرد مدبر، مفسر، دانشور اور بلند پایہ صحافی تھے۔ عبقری شخصیت کی بدولت ان کے ارادت مندوں کا حلقہ جس قدر وسیع تھا وہیں ان کے رفقا کی فہرست میں نہایت منتخب اشخاص تھے جن سے علم وذوق کے اشتراک اور فکر و نظر کی بالیدگی نے انھیں وابستہ کر رکھا تھا۔ انھیں حضرات میں ایک اہم نام نواب صدر یار جنگ کا بھی ہے جو اپنے وقت کے بلند پایہ مفکر، عالم با عمل محقق، نقاد، صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی نواب صاحب کے علمی ذوق کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> وہ ہندوستان کے آخری فارسی داں ادیبوں میں تھے۔ اس لیے کہ ہندوستان میں فارسی کا ذوق اور فارسی زبان و ادب اپنی زندگی کے آخری منزل میں ہیں۔ وہ فارسی میں استادانہ اشعار بھی کہتے تھے۔ اساتذہ کی فارسی غزلیات و قصائد کے دلکش حصوں کے انتخاب میں ان کا ذوق بہت بلند

اور ان کی نظر بڑی ناقدانہ و مبصرانہ تھی۔ فارسی ادب کے اس ذوق و کمال میں ان کے کم عمر دوست مولانا ابوالکلام آزاد کے سوان کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا۔ جن کی گواہی ان حضرات کے مراسلات و مخاطبات میں ملتی ہے جو کاروان خیال اور غبار خاطر میں شائع ہوئے۔ (۱)

مولانا ریاض الرحمن خان شروانی، نواب صدر یار جنگ اور مولانا آزاد کے تعلقات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ جہاد حریت میں ایک برسرپیکار اور انتظام امور ریاست میں دوسرا سرگرم کار۔ بقاء شان اسلاف یعنی پابندی وضع و تہذیب اسلام اور ذوق علم و تاریخ وادب میں دونوں متحد۔ ذوق کی یک جہتی نے مادۂ اجتماع کو افتراق پر غالب کر دیا۔ (۲)

مولانا ریاض الرحمن خاں شروانی ایک دوسری جگہ دونوں کے تعلق خاطر کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

مولانا کی زندگی کا سب سے اہم داعیہ جہاد حریت کی گرم بازاری تھا جبکہ نواب صاحب خاموش اور پرسکون زندگی کے شیدائی تھے۔ نتیجے میں ایک کے شب و روز کا کافی بڑا حصہ قید خانے کی چہار دیواری میں گزرا تو دوسرے کا ریاست حیدرآباد کی مسند وزارت پر لیکن دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک ایسی تھی جو دوسرے اختلافات پر حاوی رہی اور جس نے زندگی بھر کی ذہنی رفاقت اور قلبی تعلق کی صورت اختیار کر لی۔ یہ قدر مشترک علمی ذوق اور ثقافتی ہم آہنگی تھی۔ (۳)

خود مولانا آزاد اپنے ایک خط میں اس اشتراک ذوق پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

میں نظر بندی سے چھوٹا تھا۔ آپ حیدر آباد سے آئے تھے۔ دونوں جہتوں میں بعد المشرقین تھا مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی۔ (۴)

ان اقتباسات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد اور نواب صاحب کے درمیان کس نوعیت کا تعلق تھا۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا۔ اس سلسلے میں حکیم محمد اجمل خاں کی روایت کے مطابق: مولانا کی پہلے پہل ان سے ملاقات

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ (حصہ دوم) مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص:۲۶

(۲) کاروان خیال (مقدمہ) از حکیم اجمل خاں، مطبوعہ مدینہ پریس، بجنور، ۱۹۴۶ء، ص:۷

(۳) ریاض الرحمن خاں شروانی، مولانا ابوالکلام آزاد صدر یار جنگ کے تعلقات، مشمولہ مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص:۱۸۵

(۴) کاروان خیال، مرتبہ حکیم اجمل خاں، مطبوعہ مدینہ پریس، بجنور ۱۹۴۶ء، ص:۱۲

۱۹۰۶ء میں ہوئی۔[۵]

لیکن ایک داخلی شہادت کی روشنی میں یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا معلوم ہوتا ہے۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کے ایک مکتوب میں مولانا نے نواب صاحب کو لکھا ہے: آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ جب 'الندوہ' کی ایڈیٹری کے سلسلے میں میں وہاں مقیم تھا۔ ۱۹۰۵ء کی بات سے پورے پینتیس برس ہو گئے۔[۶]

اس وقت نواب صاحب کی عمر اڑتیس برس اور مولانا کی محض سترہ سال تھی۔ گویا یہ مولانا کے دور شباب کا آغاز تھا۔ دونوں کی عمروں میں انیس سال کا تقریباً ایک نسل کا تفاوت تھا۔ لیکن علم دوستی اور فکری و ذہنی ہم آہنگی کے سبب دونوں ایک جان دو قالب کے مانند تھے۔ جس کی مکمل تصویر "غبار خاطر" ہے۔ یہ مولانا آزاد کے ان چوبیس خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے دوران اسیری (۳/ اگست ۱۹۴۲-۳/ ستمبر ۱۹۴۵ء) قلعہ احمد نگر سے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو عالم تصور میں مخاطب کر کے لکھے۔ اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ اس زمانے میں مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ ۱۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں ہوا اور یہ قرارداد منظور ہوئی کہ انگریز اس ملک کے نظم و نسق سے فوراً دست بردار ہو کر ہندوستان چھوڑ دیں۔ اس حوالے سے تحریک ہندستان چھوڑو خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ۹/ اگست علی الصباح حکومت وقت نے تمام سرکردہ رہنماؤں کو ان کے بستروں سے اٹھا کر حراست میں لے لیا اور مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ مولانا آزاد اور ان کے بعض دوسرے رفقاء احمد نگر کے قلعے میں رکھے گئے۔ آزاد کا یہ سلسلۂ قید و بند تقریباً تین برس رہا۔ اسی نظر بندی کے زمانے کا ثمرہ یہ تصنیف غبار خاطر ہے۔

غبار خاطر مولانا آزاد کے زمانۂ اسیری کی وہ داستان ہے جس کی ہر صبح صدیق مکرم کے ذکر و ورد سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں وظیفہ سیاست کے علاوہ ہر سامان زندگی موجود ہے۔ نواب صاحب کی شخصیت کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ وہ خاندانی رئیس تھے۔ مال و دولت کے علاوہ قدرت

---

[۵] غبار خاطر (مقدمہ)، مرتبہ اجمل خان، انارکلی کتاب گھر، لاہور، ۱۹۴۷ء، ص: ۹

[۶] کاروان خیال، مطبوعہ مدینہ پریس، بجنور، ص: ۶۰

نے انھیں علم و حسن ذوق سے بھی نوازا تھا۔ وہ طبعاً سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے دور رہتے تھے۔ 'تحریک عدم تعاون' میں علی گڑھ کالج کی شرکت اور عدم شرکت کے مسئلے پر بعض قومی رہنماؤں سے ان کے اختلافات بھی رہتے تھے لیکن اس میں سیاسی شعور سے زیادہ قدیم تہذیبی روایات کے زیاں کے احساس کا دخل تھا۔ علمی وادبی ذوق کے ساتھ یہی تہذیبی وثقافتی ہم آہنگی دونوں کی رفاقت کا سبب بنی۔ یہ رفاقت ہی ہے جس نے اردو زبان و ادب کو غبار خاطر جیسا نایاب تحفہ دیا۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی دوچند ہے کہ اس کے مخاطب صرف اور صرف حبیب الرحمن خاں شروانی ہیں۔ سید سلیمان نے لکھا ہے کہ "ان خطوط کے مخاطب تنہا صدیق مکرم حبیب الرحمن خاں شروانی ہیں جس پر دوسروں کو رشک ہوتا تھا"۔ (۷)

غبار خاطر مولانا آزاد کی آخری تصنیف ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ مولانا کی داستان حیات کا ایک بنیادی ماخذ ہے۔ اسی طرح ادبی نقطۂ نظر سے مولانا کی برجستگی، بے ساختگی اور انشا پردازی کا ایک نادر نمونہ ہے اور کیوں نہ ہو مخاطب صدیق مکرم نواب صاحب جو ٹھہرے۔ وہ خود ایک صاحب طرز ادیب، شاعر اور انشا پرداز تھے۔

کسی بھی ادب یا فن پارے کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کرتے وقت اسلوب کے تعین میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ کون کہہ رہا ہے۔ کس زمانے میں کہہ رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے، میں مصنف، ماحول، موضوع اور مقصد کے علاوہ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ مصنف کے مخاطبین کون لوگ ہیں۔ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مخاطبین عوام ہیں یا خواص۔ ان کی علمی استعداد کیا ہے۔ ادبی ذوق کیسا ہے وغیرہ گویا کون سا اسلوب بیان ان کے دل و دماغ پر زیادہ اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر غبار خاطر کا مطالعہ کیا جائے تو یہ مولانا کے علمی مشاہدات، عملی تجربات اور ادبی وفنی نکات کا مکمل مجموعہ ہے۔ یہاں داستان محبت بھی ہے، داستان حزن وملال بھی۔ فلسفۂ حکمت و سائنس بھی، فلسفۂ الٰہیات بھی۔ غرض علم وادب اور فکر وفلسفہ کا ایک نہاں خانہ موجود ہے۔ قلعہ احمد نگر کی معرکہ آرائیاں ہوں یا بیجاپور اور گولکنڈہ کی تہذیبی شناخت۔ ملک احمد نظام، بابر،

(۷) سید سلیمان ندوی: ایک ابتدائی تاثر، مشمولہ غبار خاطر: ایک بازدید مرتبہ افشاں بانو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶، ص: ۱۱۷

ہمایوں اور جہانگیر جیسے سلاطین ہند کی سیاسی سرگرمیاں ہوں یا حسان الہند غلام علی آزاد بلگرامی، بحر العلوم ملا عبد الغنی، ملا عبد القادر بدایونی اور والہ داغستانی سے تذکرہ نگار اور علما و صلحا کا ذکر، رابعہ بصری کی خود شناسی ہو یا حسن بن صباح کی باطنیت پرستی، آین سٹائن کی جستجوئے حقیقت کی سرگرمی ہو یا شرلاک ہومز جیسے مایہ ناز جاسوسی کردار کی جرائم شناسی۔ زاہدان عشق کی خلوت پرستی ہو یا زاہدان خشک کی جلوہ آرائی، اسی طرح اردو زبان اور عربی و فارسی اور انگریزی کے مشہور زمانہ شعرا ابوالعلاء المعری، حافظ، سعدی شیرازی، فیضی، امیر خسرو، ملٹن، ولیم ورڈز ورتھ، میر، مصحفی، انیس، غالب، اقبال جیسے نابغہ روزگار شعرا کے منتخب اشعار اور ان پر مولانا کی ناقدانہ رائے۔ غرض مولانا کی یہ تصنیف مذہب، تاریخ، تہذیب، حکمت و فلسفہ اور زبان وادب کا ایک موضوعی اور وضاحتی اشاریہ ہے۔ مولانا کی یہ صدائیں زنداں سے پرے نواب صاحب جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کی سماعت کی منتظر تھیں۔ ان صداؤں کو مولانا کی زبانی سنیے۔ ایک موضوع جو بالکل سامنے کی بات معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر بناؤ کسی بگاڑ کے نتیجے میں ظہور میں آتا ہے۔ مولانا اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> سوچتا ہوں دنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہوا ہے۔ جب تک ایک موسم کے پھول مرجھا نہیں جاتے۔ دوسرے موسم کے پھول نہیں کھلتے۔ غور کیجیے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے۔ (۸)

مذہب کی ضرورت اور اس کے تسکین بخش پہلو پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

> تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفے سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی بے پروائی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ہم زندگی کے حوادث و آلام تو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سرتاسر قلبی تسکین ہے۔ (۹)

---

(۸) ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۸۲

(۹) ماخذ سابق، ص: ۳۶

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا، سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دیتا ہے۔ ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ لگا سکتی ہے۔[۱۰]

مقصد زندگی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ کوئی لگاؤ کوئی بندھن ہونا چاہیے۔ جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے۔[۱۱]

انسان کا اصلی عشق دماغ کا عشق ہے جسم کا نہیں۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں لیکن محرومی ساری یہ ہوتی ہے کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔وفی أنفسکم أفلاتبصرون ۔[۱۲]

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ آدمی اپنے احساسات کی سطح سے ذرا بھی اونچا کر لے تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کرے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔[۱۳]

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز مسکراتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں۔ اسیر ان قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں ..... جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو۔ جہاں شام ہر روز پردہ شب میں

---

[۱۰] ماخذ سابق، ص:۳۷

[۱۱] ماخذ سابق، ص:۴۳

[۱۲] ماخذ سابق، ص:۶۸

[۱۳] ماخذ سابق، ص:۷۸

چھپ جاتی ہو۔ جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں۔ جہاں دو پہر ہر روز چمکے۔ شفق ہر روز بکھرے۔ پرند ہر صبح و شام چہکیں اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھا جائے۔[۱۴]

یا اسی طرح انانیت کے حوالے سے میر انیس کے اس شعر کو نقل کرتے ہوئے کہ:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مولانا لکھتے ہیں:

یہ محض شاعرانہ تعلیاں نہ تھیں۔ یہ ان کی پر جوش انفرادیت تھی جو بے اختیار چیخ رہی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی انانیت کو بغیر کسی نمائشی وضع میں سجائے دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دنیا کے سامنے ان کی انانیت آئی مگر اس طرح آئی جیسے ایک بے تکلف آدمی بغیر سج دھج بنائے سامنے آکھڑا ہوا۔[۱۵]

اسی طرح اردو زبان وادب عربی و فارسی کے بے شمار شعراء کا کلام اور ان کے حوالے سے مولانا کی ناقدانہ رائے اپنے ہم ذوق نواب صاحب کے ادبی و تنقیدی شعور سے مخاطب ہے۔ نہ صرف مخاطب بلکہ اس پر اپنی تائید کی بھی منتظر ہے۔ نواب صاحب کو نثر کے علاوہ بزم شعر وسخن میں بھی ایک اونچا مقام حاصل تھا۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حسرت تخلص فرماتے تھے۔ لہٰذا اس میدان میں بھی دونوں کا ذوق سلیم اس معراج پر نظر آتا ہے۔ اپنے ایک خط میں مولانا نے اس تعلق خاطر کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں۔ مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوب بھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم دونوں مخاطبین کی طالبگاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھا گئی

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص:۶۹

[۱۵] ماخذ سابق، ص:۱۸۱

تھیں کہ قلم اٹھالیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔[۱۶]

یا اسی طرح ایک دوسرے خط میں مولانا نواب صاحب سے اپنی محبت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں :

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ ساری دراز نفسی اس لئے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ یاد آ گئے۔ ملاقات میسر نہیں ہے تو دل کی آرزومندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں۔[۱۷]

وہیں دوسری طرف نواب صاحب کی محبت دیکھیے کہ "کیا کہوں کس قدر مسرت نامۂ گرامی پڑھ کر ہوئی۔ اس وقت مکرر پڑھا۔ اس کے بعد کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار دماغ و دل محبت سے باغ باغ ہوا ہے۔ خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامہ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔[۱۸]

اسی خط کے جواب میں مولانا کا جواب سنیے:

سفر سے واپس ہوا تو ڈاک میں صحیفۂ محبت ملا۔ طبیعت تھکی ہوئی اور ہجوم اشغال سے بے کیف تھی۔ لیکن آپ نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کر کے ساری تھکن بھلا دی۔ کاش خط کی جگہ ہم نشینی و ہم زبانی کا موقع نکلتا۔ اگر گزری ہوئی محفلوں کو واپس نہیں لا سکتے تو کم از کم ان کی یاد میں اپنی سوگواریوں کی ایک نئی محفل غم تو بپا کر سکتے ہیں۔[۱۹]

ان اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں کے تعلقات کتنے گہرے تھے۔ ایک دوسرے کو خط لکھنے میں انہیں کس طرح ذہنی آسودگی ملتی تھی۔ ایک دوسرے کا خط پا کر مسرت و شادمانی سے جھوم اٹھتے تھے۔ زندگی کے شور و ہنگامے میں ایک کا خط دوسرے کے لیے کسی بڑی نعمت مترقبہ سے کم نہ تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ایک کا خط دوسرے کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتا تھا۔

---

[۱۶] ماخذ سابق، ص:۷

[۱۷] کاروان خیال، مرتبہ اجمل خاں، مطبوعہ مدینہ پریس، بجنور، ۱۹۴۶ء، ص:۶۱

[۱۸] ماخذ سابق، ص:۶۴

[۱۹] ماخذ سابق، ص:۶۸

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا آزاد اور نواب صاحب کے درمیان عموماً گفتگو کا موضوع شعر و ادب یا پھر کوئی علمی مسئلہ ہوتا تھا جہاں سیاست کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں۔ مولانا کے ایک دو خط میں جہاں غیر ارادی طور پر سیاسی حالات کا ذکر آ بھی گیا ہے۔ وہاں مولانا نے معذرت کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

> مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لیے نہیں ہوا کرتی۔ میری دکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہی لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی سے چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔ (۲۰)

مولانا آزاد نے غبار خاطر میں بڑی حد تک انہیں مسائل و موضوعات کو ترجیحات میں شامل رکھا جس سے نواب صاحب کو دلچسپی تھی یا ہو سکتی تھی۔ نیز ایسے مسائل و مباحث سے جان بوجھ کر اجتناب کیا ہے جو انہیں ناپسند تھے۔ دونوں کے درمیان تعلق کی نوعیت خالص علمی و ادبی ذوق تھا جس کا مولانا نے ہمیشہ خیال رکھا۔

غبار خاطر کے پیش لفظ میں حکیم اجمل خاں نے اس مسئلے پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> جن ہستیوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ تھا۔ وہ ان علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے تھے اور اس طرح الگ کہ سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی۔ نہ تو کبھی وہ ان دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کے آلام و مصائب میں شریک ہوں نہ کبھی اس کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار و اعمال سے اتفاق کریں۔ (۲۱)

مولانا آزاد کا یہ رویہ یک طرفہ نہیں تھا بلکہ نواب صاحب بھی مولانا کی کم عمری کے باوجود ان سے حد درجہ شفقت و محبت کا معاملہ رکھتے تھے۔ ایک واقعہ مولانا ریاض الرحمن خاں شروانی کی

---

(۲۰) غبار خاطر، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۳ء، ص: ۸۷

(۲۱) غبار خاطر، مرتبہ اجمل خاں، انارکلی کتاب گھر، لاہور، ۱۹۴۷ء، ص: ۱۰

زبانی ملاحظہ ہو:

غبار خاطر کی اشاعت جب عمل میں آئی۔ نواب صاحب ایک مجلس میں بڑے لطف سے مولانا کی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت کا ذکر فرمارہے تھے۔ مسلم لیگی سیاست کا بحرانی دور تھا۔ ایک صاحب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکے اور مولانا کے سیاسی افکار و اعمال پر اعتراض کر بیٹھے۔ نواب صاحب نے فرمایا ہمارا یہ میدان نہیں ہے ہم بالکل دوسرے ابوالکلام سے واقف ہیں۔[۲۲]

اس طرح غبار خاطر اور کاروان خیال کے مکاتیب اردو زبان و ادب کے وہ نگار خانے ہیں جو نہ صرف مولانا آزاد کی انشا پردازی کا بے بدل نمونہ ہیں بلکہ زبان و ادب اور فلسفہ و حکمت کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں مستقل یا ضمنی طور پر علمی و ادبی، تاریخی و تہذیبی اور تنقیدی مباحث اس قدر آگئے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ خاص کر غبار خاطر کی ہر ہر سطر سے حکمت و دانش کے چراغ جلتے ہیں اور فکر و فہم کے چشمے ابلتے ہیں جو ارباب علم و دانش کے لیے حد درجہ مفید ہیں۔ یہ خطوط صرف ادبی تخلیقی حیثیت سے ہی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان مکاتیب میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی ہم ذوقی، خلوص محبت اور تعلق خاطر کی ایک فقید المثال دنیا آباد ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے لکھا ہے:

غبار خاطر کے صفحات میں ابوالکلام نے فطرت کے مظاہر و مناظر سے جس دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ان کے رومانی مزاج، فطرت دوستی، قوت مشاہدہ اور جمال نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ان کے ادب کا خاص پہلو ہے۔ اس مطالعہ اور مشاہدہ کے اندر انھوں نے خود اپنے فلسفۂ زندگی اور عرفان حیات کے متعلق اپنی فکر و نظر کے متحرک نقوش کچھ اس طرح پیش کر دیے ہیں کہ ان کے ادب کے نفسیاتی پس منظر کا ایک گوشہ ظاہر ہو جاتا ہے۔[۲۳]

---

[۲۲] ریاض الرحمن خال شروانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور صدر یار جنگ کے تعلقات مشمولہ مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۶ ص: ۳۸

[۲۳] ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۷۱ء، ص: ۹۱

جواہر لال نہرو اور مسلم اقلیت

بھاوُک شرما
ریسرچ اسکالر، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
bhavuksharma30@gmail.com

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو پر اردو میں اب تک کوئی اعلیٰ درجہ کی سوانح عمری نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ بات اُس وقت زیادہ حیران کن ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد نہرو نے اس ملک کو مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ جمہوری اور سیکولر بنیاد پر تشکیل کرنے کی کوشش کی۔ آزادی سے قبل نہرو نے 'ہندی-ہندو-ہندوستان' کے تصور کی پر زور مخالفت کی اور وہ اکیلے ایسے رہنما تھے جنہوں نے 'سودیش' میں کوئی مضمون شائع نہیں کیا تھا۔[1] جنوری ۱۹۳۴ کو نہرو نے آئین ساز اسمبلی کے قیام کا مشورہ دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اگر اس اسمبلی کے مسلم ممبران کچھ مذہبی مانگیں اٹھائیں گے تو میں انہیں تسلیم کر لینے میں کوئی دیر نہیں کروں گا۔ فرقہ پرستی کا حل جدا ہونے میں نہیں بلکہ فرقوں کے اندر بسے ڈر کو دور کرنے اور انکے سامنے اُنکے مفاد کو واضع کرنے میں ہے۔

نہرو کا ماننا تھا کہ سبھی فرقوں کے طاقتور اشرافیہ (elite) اپنے مفاد کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پوری قوم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی پوری قوم کے مفاد ہیں۔[2] نہرو نے اس مشکل کا حل یوں نکالا کہ آہستہ آہستہ جب اقلیتوں کی بیشتر آبادی کا ڈر کم ہو جائے تب اُن پر یہ سچ آشکار کیا جائے کہ انکے مسائل اور مفاد اُنکی قوم کے خواص سے جدا ہیں اور دوسرے سبھی فرقوں کے عام لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔[3] تقسیم کے گھاؤ ہرے تھے لہذا مسلمانوں میں ایک ڈر کا ماحول تھا۔

---

[1] گیتا پریس کے اس رسالے میں گاندھی جیسے قائدین کے بھی مضمون شائع ہوئے تھے مگر نہرو نے کبھی ایسا نہ کیا
- Mukul, Akshay, *Gita Press and the Making of Hindu India,* Harper Collins, 2015, p.231

[2]
Nehru, Jawaharlal, *Recent Essays and Writings: On the Future of India, Communalism and Other Subjects,* Kitabistan, Allahabad, 1935, pp. 71-72.

[3] ماخذ سابق

نہرو کے لیے ہندوستانی مسلمان محض اعداد و شمار تک محدود نہیں تھے بلکہ وہ انہیں اعتماد دلانا چاہتے تھے کہ یہ ملک اُن کا اپنا ہے۔ تقسیم کے بعد کے اس ہیبت ناک دور میں نہرو اکثر کہا کرتے تھے کہ "مجھے خود پر غصہ آتا ہے کہ ایسے وقت میں ہم لوگ حفاظتی اقدام کے لیے اپنے ساتھ ہتھیاروں سے لیس محافظ لے کر چلتے ہیں"۔ (۴)

ایک مرتبہ جب کنگزوے کیمپ میں جواہر لال نہرو نے دیکھا کہ ایک نوجوان نے مسلمانوں کے خلاف ایک بھیڑ اکٹھا کر لی ہے تو بغیر کچھ سوچے وہ سیدھے اس بھیڑ میں کود گئے اور اس نوجوان کا گریبان پکڑ کر کہا کہ "ان مسلمانوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ اگر کچھ نہیں تو پھر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔ ہمیں انصاف پسند ہونا چاہیے۔ اگر انصاف کا تقاضا ہے اور یہ ضروری ہے تو ہم پاکستان کے خلاف جنگ چھیڑ دیں گے اور تب تم فوج میں شامل ہو جانا مگر جیسا کام تم ابھی کر رہے ہو وہ بہت خراب ہے اور بزدلی کی عکاسی کرتا ہے"۔ (۵)

سبھی صوبوں کے وزراء اعلیٰ کو لکھے ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ کے اپنے خط میں نہرو یہ واضح کرتے ہیں کہ مسلم اقلیت، جو بہت بڑی تعداد میں ہندوستان میں ہے، اسے ہندوستان میں ہی رہنا ہے اور اس بات پر کسی بھی طرح کی کوئی بحث نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد نہرو نے ان سب سے یہ درخواست کی کہ اپنے اپنے صوبوں میں اقلیتوں کی حفاظت کا ذمہ وہ پوری ایمانداری سے نبھائیں۔ (۶) جب کانگریس میں دائیں بازو سے جڑے خیالات سے متاثر سیاست دانوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا تب نہرو نے اس کی مخالفت کی۔ پرشوتم داس ٹنڈن، جو "ہندی- ہندو- ہندوستان" کے حمایتی تھے، کانگریس کے صدر کے عہدے کے لیے کھڑے ہوئے تو نہرو نے انکی امیدواری کی مخالفت کی۔ نہرو نے پرشوتم داس ٹنڈن کو لکھا کہ "آپ ہندوستان میں ایک فرقہ وارانہ سوچ اور احیائے رسوم کے حامی بن چکے ہیں اور میرے دماغ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا کانگریس بھی اسی راہ پر

---

(۴)

Pyarelal, *Mahatma Gandhi: The Last Phase,* Navajivan Publishing House, Ahmedabad, vol.2, p. 431.

(۵) ماخذ سابق

(۶)

G. Parthasarthi, *ed. Letters To The Chief Ministers 1947-1961,* vol.1, Oxford University Press, New Delhi, 1985, p. 2

گامزن ہے؟"[۷]

پانچ جنوری ۱۹۴۸ کو صوبوں کے وزراء اعلیٰ کے نام خط میں جواہر لال نہرو بریگیڈیئر عثمان کی تعریف کرتے ہیں اور ان کو آگاہ کرتے ہیں کہ ہمیں وہ راہ بالکل بھی نہیں اپنانی چاہیے جس پر پاکستان عمل کر رہا ہے۔[۸] جب نہرو کو محسوس ہوا کہ کچھ اخبارات ایسے ہیں جو ماحول میں خوف پیدا کر رہے ہیں، انہوں نے ۹ فروری ۱۹۴۸ کو ہندی، انگریزی اور اردو کے کچھ اخباروں اور رسالوں پر پابندی عائد کر دی۔[۹]

۵ فروری ۱۹۵۰ کو اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت کو لکھے اپنے خط میں جواہر لال نہرو ایودھیا کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں اور انہیں اس بات سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ اس مسئلہ کا ہندوستان پر اور بالخصوص کشمیر پر بہت گہرا اثر ہو گا۔[۱۰] پانچ مارچ ۱۹۵۰ کو کشوری لال مشروع والا کو لکھے خط میں بھی نہرو نے ایودھیا مسجد میں ۲۱ اور ۲۲ دسمبر کی رات کو رکھی گئی مورتیوں کو لے کر فکر ظاہر کی۔ انہوں نے کہا کہ اتر پردیش حکومت نے بہادری تو کافی دکھائی مگر کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔[۱۱]

۱۷ اپریل ۱۹۵۰ کو پنت کو لکھے خط میں نہرو نے کہا کہ میرے اس صوبے کی فضا ایسی ہو چلی ہے کہ میں خود کو اس جگہ اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ ایودھیا میں جو ہو رہا ہے وہ تو برا ہے ہی مگر فیض آباد میں جس طرح ایک مسلم کا ہوٹل انتظامیہ نے خالی کرایا اور ایک دن بعد اُس پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا وہ اور بھی خطرناک ہے۔[۱۲] افسوس ہے کہ ہر دوسرے دن سننے کو ملتا ہے کہ کہیں کسی

---

(۷)
Gopal, *Sarvepalli Jawaharlal Nehru: A Biography,* vol.2, 1947-1956, Oxford University Press, New Delhi, 1985, p. 93

(۸)
G. Parthasarthi, *ed., Letters To The Chief Ministers 1947-1961,* vol.1, Oxford University Press, New Delhi, 1985, p. 45

[۹] ماخذ سابق، ص ۶۰

(۱۰)
Selected Works of Jawaharlal Nehru, series 2, vol.14, November 1949-April 1950, part 1, p. 444

[۱۱] ماخذ سابق، ص ۴۴۴-۴۴۵

[۱۲] ماخذ سابق، ص ۲۹۴

مسلمان کی داڑھی کھینچ لی گئی ہے، کہیں ان پر تھوکا گیا ہے اور کہیں اُنکی عورتوں کو لے کر بیہودہ باتیں کی گئیں اور انہیں پاکستان چلے جانے کا مشورہ دیا جانا تو جیسے روزانہ کی بات ہو چلی ہے۔[۱۳] ایسا کرنے والوں کی تعداد کم تھی مگر پھر بھی یہ ہونا مسلمانوں کے ڈر کو اور بڑھائیگا۔ نہرو کا کہنا تھا کہ صرف تہذیب کی بات کرنے سے کام نہیں چل سکتا، تہذیب کو پہچان کر اُسکے مطابق کام کرنا بہت ضروری ہے۔

اور یہی وجہ تھی کہ نہرو نے ہندو کوڈ بل پیش کرنے کے باوجود مسلمانوں کے قوانین میں کوئی اصلاح نہیں کی۔ ایسا کرنے سے مسلمانوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ان کے مجموعی حقوق چھین لیے جائیں گے۔ نہرو کا ماننا تھا کہ قانون میں "پرسنل" جیسا کچھ نہیں ہونا چاہیے، لہذا ہندو اور مسلم دونوں کے پرسنل قوانین میں ترمیم کی اشد ضرورت ہے مگر مسلمانوں میں یہ ترمیم خود انکے اندر سے خود احتسابی کے ذریعے آنی چاہیے۔ اس پر بہت تفصیل سے ریبا سوم نے اپنے ۱۹۹۴ء میں شائع تحقیقی مضمون میں لکھا ہے۔[۱۴]

بنگال میں بگڑتے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اور حفاظتی اقدام کے بارے میں بتاتے ہوئے نہرو نے بنگال کے وزیر اعلی بدھان چندر رائے کو خط لکھا تھا جس میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ تمام کوششوں کے باوجود بنگال میں حالات تسلی بخش نہیں ہو رہے ہیں۔[۱۵] مشرقی بنگال میں ہندوؤں پر ہو رہے ظلم نے معاملے کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ ڈر اور بے چینی میں مبتلا بنگال کی آبادی کو راحت پہنچانے کے لیے نہرو نے پاکستان کے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا۔ جس میں نہ صرف اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کو سارے حقوق میسر ہوں گے بلکہ اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا کہ جو بھی ایک ملک سے دوسرے ملک جانا چاہے گا اسے

---

[۱۳] ماخذ سابق، ص ۲۹۴

(۱۴)

Som, Reba, "Jawaharlal Nehru and the Hindu Code: A Victory of Symbol over Substance?" in *Modern Asian Studies*, vol. 28, No. 1 (Feb., 1994), pp. 165-94.

(۱۵)

Selected Works of Jawaharlal Nehru, Series 2, Vol.14, November 1949-April 1950.

خیر وعافیت سے وہاں پہنچایا جائے گا۔[۱۶] اسکے علاوہ مشرقی و مغربی بنگال اور آسام میں اقلیتوں کے لیے ایک کمیشن کا قیام طے پایا جسکی صدارت ان صوبوں کے وزراءِ اعلیٰ کریں گے اور اس بات کا بھی تعین کیا گیا کہ کمیشن میں ایک ہندو اور ایک مسلمان ممبران شامل ہوں گے جو صوبائی مقننہ کی حمایت سے نامزد کیے جائیں گے۔[۱۷]

ان سب اقدام کے بعد بھی نہرو نے فرقہ واریت سے لڑائی میں ڈھیل نہیں برتی۔ جہاں 'الجمعیت' کے لکھنے کے طریقے پر مولانا حفظ الرحمن کو یہ لکھ بھیجا کہ اس طرح کی کالم نگاری سے انہیں سخت چڑھ ہے تو وہیں دوسری جانب کلکتہ میں ہوئے فسادات پر گورنر جنرل راج گوپالاچاری کو اُن فسادات کی فکر میں ایک طویل خط لکھ بھیجا۔[۱۸] جب الہ آباد سے نکلنے والی 'امرت پتریکا' میں مسلمانوں کے تعلق سے ایک بہت نامناسب بات شائع ہوئی تو نہ صرف مولانا آزاد کو خط لکھ کر معافی مانگی بلکہ اس اخبار پر مقدمہ بھی چلانے کا فیصلہ کیا۔[۱۹] نہرو نے ستمبر ۱۹۵۱ میں اُتر پردیش کے وزیرِ تعلیم سمپورنانند کو خط لکھتے ہوئے کہا کہ 'میرے مندر میں ہری رہے، تیری مسجد میں شیطان' جیسے نفرتی جملے آٹھویں جماعت کی کتابوں میں ہونا بہت ہی شرم اور حیرت کی بات ہے، ایسا کوئی بھی مواد فوراً ہٹایا جائے۔[۲۰] اسی طرح جب نہرو کو یہ خبر ملی کی راجستھان کے کچھ علاقوں میں مسجدوں اور گرد واروں کو مندروں میں تبدیل کیا جارہا ہے تو اُنہوں نے وہاں کے وزیرِ اعلیٰ موہن لال سکھاڈیا کو اس معاملے میں دخل دینے کے لیے کہا۔[۲۱] وقتاً فوقتاً نہرو لگاتار اقلیتوں کی حفاظت

---

(۱۶)

Pallavi, Raghavan, *Animosity At Bay: An Alternate History of The India – Pakistan Relationship*, 1947-1952, Harper Collins, Noida, 2020, p. 65

(۱۷) ماخذ سابق، ص ۶۵

(۱۸)

Selected Works of Jawaharlal Nehru, series 2, vol.19, July-October 1952, pp. 543-44.

(۱۹) ماخذ سابق، ص ۵۴۵

(۲۰)

Godbole, Madhav, *The God Who Failed: An Assessment of Jawaharlal Nehru's Leadership*, Rupa Publications, New Delhi, 2014, p.144

(۲۱) ماخذ سابق، ص ۱۴۶

کو ترجیح دیتے ہوئے ایسے قدم اٹھاتے تھے کہ ان پر مسلمانوں کو غیر ضروری فائدہ پہنچانے اور انہیں رجھانے کے الزام لگائے گئے۔ ۱۹۵۵ میں غیر معمولی رفتار سے بڑھ رہے فرقہ وارانہ فسادات نہرو کی کوششوں کی دیانتداری اور قابل ساتھیوں کی مدد سے ۱۹۵۸ آتے آتے کافی کم ہو چلے تھے۔

نہرو اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۳۰ کے اواخر سے لے کر قیام پاکستان تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مسلم لیگ کا دبدبہ رہا۔ ۱۹۷۷ میں شائع ہوئی خواجہ احمد عباس کی کتاب *I Am Not an Island* میں ۱۹۳۵ کے آس پاس یونیورسٹی کی فضا مسلم لیگ کے حق میں تبدیل ہونے کا ذکر ہے۔[۲۲] عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۰ کے ابتدائی سالوں میں یونیورسٹی میں مسلم لیگ کا دبدبہ چاروں طرف پھیل چکا تھا۔[۲۳] جس طرح کی تقریر جناح یہاں کرتے تھے اور جس طرح کے خط یہاں سے جناح کو لکھے جاتے تھے وہ اس بات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان کی آزادی کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا لیکن نہرو نے مخالفت کے باوجود علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ اسکی روح کی از سرِ نو تعمیر کرنے کی بھی کوشش کی۔ جنوری ۱۹۴۸ کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں آئے اور تقریر کی۔ نہرو جانتے تھے کہ اس بات کے اعتراف کے ساتھ یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ مسلمانوں کا تعلق اسی ملک سے ہے۔[۲۴] اپنی تقریر میں جواہر لال نہرو نے کہا کہ میں نے یہاں آنے کی آپ کے وائس چانسلر کی دعوت قبول کی کیونکہ میں آپ لوگوں سے مل کر کچھ آپ کے ذہن کو جاننا چاہتا تھا اور کچھ اپنے ذہن کی تصویر آپ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ ہم لوگوں کو ایک دوسرے کو سمجھنا ہو گا اور بھلے ہم سبھی باتوں پر متفق نہ ہوں پھر بھی ہمیں یہ تو

---

(۲۲)

Abbas, Khwaja Ahmad, *I Am Not an Island: An Experiment in Autobiography*, Vikas Publications, New Delhi, 1977, pp. 112-118

(۲۳)

Habib, Irfan, *ed. Studies in Medieval Indian Polity and Culture: The Delhi Sultanate and Its Times*, Oxford University Press, New Delhi, 2016, p. 9

(۲۴)

Gautier, Laurence, *Between Nation And 'Community': Muslim Universities and Indian Politics after Partition*, Cambridge University Press, 2024, p. 63.

معلوم ہونا ہی چاہیے کہ ہم کن باتوں پر متفق ہیں اور کن باتوں پر ہمارے بیچ اختلاف ہے۔[۲۵]

لارینس گوتیئر کا کہنا ہے کہ نہرو نے وہاں موجود سارے لوگوں کو "مسلمان" کہہ کر مخاطب کیا اور اس طرح انہیں جداگانہ طور پر دیکھا۔ مگر یہ مطالعہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ایسا کر کے نہرو مسلمانوں کو لے کر عام ہندوستانیوں بالخصوص ہندوؤں میں موجود شک وشبہات کو دور کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ کچھ ہی دن پہلے ہندوستان کے مسلمانوں، خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذۂ کرام کو پاکستان بنوانے میں کلیدی کردار نبھانے کی معرفت مبارک باد پیش کی گئی تھی، لہٰذا نہرو نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ محسوس کرائیں کہ ان کی طرف سے نہرو کا اور باقی ہندوؤں کا دل صاف ہے۔ اتنا ہی نہیں، ۱۹۵۱ میں نہرو نے بی ایچ یو کے ساتھ ساتھ اے ایم یو کو بھی سینٹرل یونیورسٹی قرار دیتے ہوئے اس بات کو اور واضح کیا کہ ہندوستان کے مستقبل میں ان دونوں ہی اداروں کا ایک خاص کردار رہے گا۔

ٹھیک اسی طرح جب نہرو کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک تین لڑکیاں، جن کی مقبولیت "زیدی بہنوں" کے نام سے تھی ایک احتجاج کے دوران جیل میں بند کر دی گئی تھیں، تو انہوں نے بذات خود اس معاملے میں مداخلت کی اور زیدی بہنوں کی رہائی کو ممکن بنایا۔ اس بات کا اعتراف خود زیدی بہنوں میں سے ایک زاہدہ زیدی اپنے کیمپس ناول "انقلاب کا ایک دن" میں کیا ہے۔[۲۶]

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اقلیتوں کو لے کر نہ صرف سنجیدگی سے سوچا اور لکھا۔ ان کی بدولت اقلیتوں کو ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں باقی قوموں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کا موقع ملا۔ اسکے باوجود اردو میں نہرو کی ایک اعلیٰ درجے کی سوانح عمری اب تک اپنے مصنف کی منتظر ہے۔

---

(۲۵)

Jawaharlal Nehru's Speeches 1946-1949, Publication Division 1949, p. 336

[۲۶] زاہدہ زیدی، انقلاب کا ایک دن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء۔

تبصرۂ کتب

حضرت مولانا محمد ادریس نگرامی، تحقیق و اضافہ ، ڈاکٹر عمار انیس نگرامی، تذکرہ علمائے حال: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، خوبصورت سرورق، صفحات : ۱۹۸، قیمت: ۵۰۰روپے، سن اشاعت:۲۰۲۵ء، پتہ: مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور لکھنؤ کے دیگر مکتبے۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں یعنی قریب سوا سو سال پہلے منشی نول کشور کے مطبع سے اس زمانہ کے علماء کے سوانح اور احوال کے تعلق سے ایک عمدہ رسالہ شایع ہوا۔ مصنف کی نظر میں یہ رسالہ مفیدہ و عجالہ تھا۔ نام اس زمانہ کے ذوق کے مطابق 'تطییب الاخوان بذکر علماء الزمان' رکھا گیا، تذکرہ علمائے حال اس کا لقب ٹھہرا اور پھر یہی اصل نام پر غالب آگیا۔ مصنف، لکھنؤ کے نواحی قصبہ نگرام کی نیک نام بستی کے ایک نہایت معروف معزز اور محترم خاندان کے گویا گل سرسبد تھے۔ مولانا محمد علی مونگیری کے فیض یافتہ تھے، ان ہی کے مشورے اور ارشاد سے اس رسالے یا کتاب کی تالیف شروع کی اور اس عمل کی ہمت افزائی کرنے والوں میں خاص طور پر علامہ شبلی کی تائید حاصل کرلی جنھوں نے صرف اس تجویز کی عمدگی ہی ظاہر نہیں کی یہ بھی لکھا کہ "مجھ کو مدت سے خیال تھا" مولانا عبدالحی حسنی کی نزہۃ الخواطر کی تالیف کا بھی وہی زمانہ تھا، اس طرح اس کتاب کی تالیف میں ندوۃ العلماء کے مقاصد کی کارفرمائی بھی ظاہر ہوئی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ مولانا عبدالعلی آسی نے یہ توقع ظاہر کی کہ علماء و فضلا کے اس تاریخی تذکرے سے اسلامی علم و فضل کا قیامت تک چرچا رہے گا اور اس کے ذریعہ سے باہمی اتفاق اور اتحاد بڑھانے کے لیے ایک دوسرے سے خط و کتابت اور ملاقات کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا۔ باہمی اتفاق و اتحاد کے جو بھی نتائج مرتب ہوئے اس سے قطع نظر یہ کتاب ایک صدی قبل کے چار سو سے زیادہ کے علماء کے ذکر کا نہایت نادر و نافع مجموعہ بن گئی۔ اختصار نے تذکرہ کو محض مناقب نامہ نہیں بننے دیا اور جامعیت نے کتاب کی افادیت میں بڑا اضافہ کردیا۔ مولف کی تحریر میں ان کے عہد کا رنگ صاف ہے جیسے یہ عبارت کہ "افسوس صد افسوس، ہمارا اسلام، ملک ہند میں آکر ایسا غریب و بے کس ہوگیا کہ شیرازہ جمعیت اسلامیان بالکل منتشر و پراگندہ ہوگیا۔ اپنے مذہب و قوم پر جان فدا کرنے والے مسلمان مثل برگ اشجار خزاں رسیدہ کے پژمردہ ہوگئے"۔ ان تاثرات کو انیسویں صدی کے اواخر میں

انگریزی حکومت کے جابرانہ تسلط، خصوصاً مسلم دشمنی کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ ساتھ ہی ندوہ کی تحریک کو ذہن میں رکھ کر اسی عبارت کے دوسرے اقتباس کو دیکھنے کی ضرورت ہے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ ”الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ حق جل شانہ نے امت مرحومہ کی دستگیری فرمائی اور اپنے ایک برگزیدہ ومقدس بندہ کے دل میں تجدید اسلام کا جوش پیدا کر دیا۔“ یہ مقدس بندہ، ندوہ کے ناظم اول مولانا مونگیری تھے۔ اسی طرح اور بھی علماء کے نام ونشان اور ان کی اصل قدر کی شناخت میں اس کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ علامہ شبلی کے ذکر میں اس کتاب میں دی گئی تاریخ ولادت مئی ۱۸۵۷ء مطابق ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ کا ذکر بعد کے محققین شبلی کے لیے گویا ناگزیر ہو گیا ہے۔ علامہ کے تعلق سے یہ جملہ بھی خوب ہے کہ ۱۴/سال میں تمام وکمال علوم فقہ وحدیث وادب وتفسیر وفلسفہ وغیرہ حاصل فرما کر تاج فراغ سر پر رکھا۔ علامہ کی جودت ومتانت کی شہرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ وہ علامہ کی ملاقات سے مستفید ہوئے اور اکثر توجہات غائبانہ ان پر مبذول ہوئیں۔ صاحب تذکرہ نے علماء کے احوال کے جمع وترتیب کے لیے اس زمانہ میں بڑا اہتمام کیا، خطوط لکھے، ملاقاتیں کیں، کہیں تعاون ملا، کہیں سرد مہری کا سامنا ہوا لیکن بالآخر وہ ایک نہایت مفید کتاب مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کتاب چھپی اور پھر نایاب ہو گئی۔ مسرت کی بات ہے کہ گرامی قدر مولف کے حفید مولانا محمد اویس نگرامی ندوی کے نبیرہ ڈاکٹر عمار انیس نگرامی نے اپنے بزرگوں کی علمی وراثت کی اہمیت محسوس کی اور بڑے سلیقے اور شوق سے اس کتاب کو شایع کر دیا۔ مقدمہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہے اور اس بات کی تصدیق میں ہے کہ تاریخ وسوانح سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک مفید دستاویز ہے۔ شکر واعتراف کے عنوان سے طابع وناشر ڈاکٹر عمار انیس نگرامی نے اپنے خاندان اور علمائے نگرام اور خصوصاً مولف کتاب کا عمدہ تعارف بھی پیش کر دیا۔ (عمیر الصدیق ندوی)

معصوم مرادآبادی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تصنیفات، اہل علم وادب کی نظر میں: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۶۷، قیمت: ۳۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، پتہ: ہیومن ویلفیئر کونسل، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵، لکھنؤ اور حیدرآباد کے مشہور مکتبے۔ موبائل نمبر: ۹۶۵۴۶۲۵۶۶۳

پروفیسر محسن عثمانی کے متعلق برسوں پہلے سید حامد نے لکھا تھا کہ ان کی اٹھان، فکر اور اسلوب نگارش کو دیکھ کر یہ امید قوی ہو جاتی ہے کہ بالآخر ان کا شمار صاحب طرز ادیبوں میں ہونے لگے گا۔ آج

بامقصد و مثبت فکر و خیال اور نہایت پر اثر، پرکشش اور حسن آفریں اسلوب کے لیے اردو زبان و ادب میں کتابوں اور چہروں کے درمیان نظر جس چہرے پر بے اختیار جاتی اور جم جاتی ہے وہ سید حامد کے برسوں پہلے ان ہی ممدوح کا ہے۔

اسلامیات، ادبیات، شخصیات، اخلاقیات اور عالمی مذہبی تحریکات و سیاسیات پر محسن عثمانی کی تحریروں سے اردو زبان کی ثروت میں جس طرح اضافہ ہوا ہے، وہ گذشتہ صدی کے ان مصنفین کی یاد دلاتا ہے جن کی تحریروں کے ایک ایک لفظ کا انتظار سنجیدہ اور باذوق قارئین کو بے قرار کیے رہتا تھا۔

پروفیسر عثمانی بنیادی طور پر روایات علمی کے علم بردار ہیں لیکن جدت کی لذت سے آشنا ہونے میں وہ محض خشک پرہیز گار بھی نہیں۔ ان کی ہر تحریر اسی خیال کی شاہد عدل ہے۔ کاتب ازل کی فیاضیوں کا معاملہ تصنیفات و تالیفات کے باب میں ان کے لیے قابل رشک رہا۔ اندازہ ہے کہ ان کی تعداد چالیس کے آس پاس ہو چکی ہے۔ تعداد کے ساتھ تنوع کی کثرت نے اس نعمت کو اور قابل قدر بنا دیا۔ قدر دانی کا ایک حصہ مشہور صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی کے لیے یوں خاص ہوا کہ انھوں نے ان قدر دانوں کے جذبات اور خیالات کو یک جا کر دیا جنھوں نے عثمانی صاحب کی کتابوں پر گہری نظر کی اور حسن و قبح کے معیاروں کی مدد سے ان کی تحریروں کی قدر و قیمت کی تعیین کی۔ ان قدر دانوں کے نام بھی اگر یہاں شمار کیے جائیں تو صفحات کو تنگیِ داماں کی شکایت بجا طور پر ہو گی۔ سید حامد، ڈاکٹر منظور عالم سے شکیل شفائی تک بیسیوں اردو ادب کے مزاج داں ان صفحات میں موجود ہیں۔ فاضل مرتب نے ان تبصروں، تقریظوں اور تذکروں کو 'خاصے کی چیز' سے تعبیر کیا ہے جس سے شاید ہی کوئی اختلاف کر سکے۔ افکار و نظریات میں جہاں انفرادیت کی خوبی ہو اور جہاں قدم قدم اسلوب کی گل کاری، دامن دل کو کھینچتی نظر آتی ہو، جہاں دل کی دردمندی ہو اور لہجے کی ارجمندی ہو، جہاں صرف زخم کی نمائش ہی نہ ہو، مداوا اور درماں کا ساماں بھی ہو، ایسے قلم کے سفر میں شریک کیوں نہ ہوا جائے۔ عثمانی صاحب کی ایک بہت مقبول اور مشہور تحریر ہے جس کا عنوان 'مرے قلم کا سفر، منزل بہ منزل' ہے۔ لائق مرتب نے بطور مقدمہ اس کو بھی شامل کتاب کیا ہے۔ یہ گویا متن ہے جس کی شرح باقی تمام مضامین ہیں۔ تصنیف شناسی کے ساتھ مصنف شناسی کی روایت نئی نہیں ہے۔ لیکن اس کتاب سے اس روایت کو نئی زندگی ضرور ملی ہے۔

(ع۔ص)

ڈاکٹر آصف عمر، مترجم فاروقی ارگلی، ہندی ادب میں مسلم ادیبوں کا حصہ: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۲۵۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۲ء، پتہ: فرید بک ڈپو، ۲۱۵۸، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

ہندی ادب کی ترویج میں مسلمانوں کا حصہ موجودہ حالات میں گویا حیرت انگیز اور قابل استعجاب بات ہے، جب کہ اس کے برعکس اردو کی ترویج میں ہندوؤں کی حصہ داری کے نام سے چونکنے یا چونکانے والی کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ ادب میں وقتی وسطحی سیاست کی دخل اندازی کا نتیجہ شاید یہی ہے۔ زیر نظر کتاب کا مقصد غالباً یہی ہے کہ ملک کی ثقافتی وتمدنی اور تہذیبی روایات کے فروغ میں حقیقتوں کا مطالعہ کھلی آنکھوں، کھلے ذہن اور کھلے دل سے کیا جانا چاہیے۔ زبان وادب صرف زمانہ اور اس کی ارتقاو تبدل پذیر قدروں کے پیمانے ہیں۔ معاشرہ اور مذہب ان ہی اقدار کے عکاس بن جاتے ہیں۔ ہندی ادب کی تاریخ کو اس کتاب کے مصنف نے ہزار سالہ تاریخ سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ دور ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تاریخ دو ہزار سال سے بھی زیادہ کی ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہندی ادب کی ابتدا اور ارتقاء کتاب کا بنیادی موضوع نہیں، اس لیے مذکورہ دعویٰ کے لیے دلائل کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ عہد قدیم کے نام پر دو مسلمان ادیبوں یا شاعروں کا ذکر آگیا کہ یہ عبدالرحمٰن اور امیر خسرو ہیں جن کی زبان 'اپ بھرنش آمیز' ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ کھڑی بولی یعنی آج کی ہندی بھاشا کے بنیاد گزار عہد قدیم میں امیر خسرو ہی ہیں۔ عبدالرحمٰن کا نام بھی ان کے ساتھ ہی آتا ہے۔ اس کے بعد کے زمانے میں ملک محمد جائسی، کبیر، رحیم، قطبن، منجھن وغیرہ کے ہیں۔ خسرو پر گفتگو ذرا تفصیل سے ہے۔ عبدالرحمٰن اور ان کی تخلیق سندیش راسک پر بھی خاصی توجہ کی گئی ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندی ادب میں جہاں کبیر، جائسی، رسکھان اور رحیم کا ذکر ہے وہیں امیر خسرو کو بھی اس عہد میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ عہد وسطیٰ کے بعد موجودہ ہندی ادب میں مسلمان ناموں کی تلاش اور تعارف کی گفتگو میں سب سے پہلے راہی معصوم رضا کا نام آتا ہے۔ آخر میں مصنف کا قول فیصل اس طرح ہے کہ ہندی ادب کی تاریخ کو مالا مال کرنے کا سہرا جس طرح ہندو شاعروں کے سر ہے، اسی طرح مسلمان شعرا بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

کتاب کے نشیب وفراز سے قطع نظر موضوع کے لحاظ سے یہ معلومات افزا ہے، گو تکرار اور

تضاد کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن مصنف کا مقصد اور نیک نیت کتاب کو قدر کے لائق بنانے میں اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ سرورق پر فاروق ارگلی کا نام مترجم کی حیثیت سے درج ہے لیکن کلمات تقدیم اور پیش نامہ میں ان کا کہیں ذکر نہیں، یہ بھی صاف نہیں ہوتا کہ اصل کتاب ہندی ہی میں تھی؟

(ع۔ص)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، بیان سہیل، صفحات ۱۹۸، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۲۶ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، ایمیل: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین سے شائع ہونے والی یہ تازہ کتاب ایک ایسے نابغۂ روزگار کے بیان پر مشتمل ہے جس کی حکایت ہستی سننے، پڑھنے کا اشتیاق اردو کے ہر باذوق اور شائق شعر وادب کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی وہ شعلہ نفسی و مبنی بر حقیقت نوا سنجی ہے جو نہاں خانۂ دل میں گرمی و تڑپ پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا ادبی و شعری ذوق وہبی ہے۔ فی البدیہہ شاعری کی جو مثالیں اقبال سہیل کے کلام میں موجود ہیں وہ اردو کے بہت کم شعراء کے یہاں ملتی ہیں۔ ذہانت و عبقریت اور مشاہدے کی قوت ان میں ایسی زبردست تھی کہ ان کا اشہبِ قلم علم و فن کی جس چوٹی کو چاہتا تھا سر کر لیتا تھا۔ ان کی شگفتہ اردو نثر کا معیار اس قدر اعلیٰ وارفع ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں کے بلند سے بلند تر لٹریچر کے بالمقابل اس کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں دیباچہ کے بعد پہلے علامہ اقبال سہیل اور سہیل شناسی پر محققانہ اور مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ پچاس صفحات پر مشتمل اس مقالے میں مختصر سوانح کے ساتھ سہیل شناسی پر اب تک جو علمی و تحقیقی کتابیں لکھی گئیں، رسائل کے خاص نمبرات یا سیمیناروں کے جو مجموعۂ مقالات سامنے آئے ہیں ان کے حوالے سے معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہندو بیرون ہند کی بعض نامور شخصیات جیسے سرور خاں گویا اور سروجنی نائیڈو وغیرہ یا ان کے احباب و معاصرین اور بعض تلامذہ کی نظر میں اقبال سہیل کے مقام و مرتبہ کی تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ اقبال سہیل کی نعت گوئی شروع سے اہل ذوق کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ مصنّف نے بھی اس کو موضوع بحث بنایا ہے۔ تصور قوم و وطن کے سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال باہم مختلف الخیال تھے۔ اقبال سہیل نے مولانا مدنی کی حمایت میں اس کا منظوم جواب دیا تھا۔ ”علامہ اقبال اور اقبال سہیل“ کے نام سے ایک مختصر مضمون میں یہ جواب نقل کیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ جب علامہ اقبال کو اس

جواب کا پتہ چلا تو کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ میرا جواب دینے والا بھی اقبال ہی ہے۔

اقبال سہیل کی غالب شناسی کے تجزیے میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ان کے متعلق یہ منفرد رائے دی ہے کہ اقبال سہیل ایسے پہلے شاعر و نقاد ہیں جنھوں نے غالب کے شعری محاسن کو اجاگر کرنے میں اپنی خداداد تنقیدی بصیرت سے کام لے کر ثابت کیا کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور۔ "عظمت شبلی اقبال سہیل کی نظر میں" مقالے میں سہیل صاحب نے اپنے فارسی و اردو کلام اور نثر میں شبلی کی عظمت کے متعلق جو نقوش و تاثرات اور شہ پارے یادگار چھوڑے ہیں ڈاکٹر صاحب نے مختصر پس منظر کے ساتھ نقل کیے ہیں۔

فاضل مصنّف نوادر کی تلاش میں اکثر سرگرداں رہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی تحقیقات کو ایسی انوکھی دریافت و بازیافت سے سجائیں جن سے ان کے قارئین کو کچھ جدت محسوس ہو۔ ان کی تلاش و تفحص کا یہ انداز ان کی شناخت بن گیا ہے۔ چنانچہ ایک صدی قبل "علی گڑھ منتھلی" میں شائع شدہ اقبال سہیل کے بعض فارسی و اردو قصائد اور غزلیں وغیرہ نیز ایک قطعۂ تاریخ جو کلیات سہیل میں شامل نہیں ہے حاصل کر کے نہ صرف انہیں اس کتاب کی زینت بنایا ہے بلکہ ان کے سیاق و سباق اور پس منظر پر قیمتی معلومات درج کی ہیں۔ ان میں ایک فارسی قصیدہ جو سر راس مسعود کی شادی کے موقع پر انہوں نے کہا تھا بڑا اہم اور دلچسپ ہے۔ مصنف نے پنڈت جواہر لال نہرو کی شان میں کہی جانے والی ایک اردو نظم کی نشاندہی کی ہے مگر یہ اردو نظم نظر نہیں آئی۔ ان منظوم نوادر کے علاوہ دو نادر نثری تحریریں ہیں۔ ایک ندوہ کی قدیم انجمن "معائنہ انجمن الاصلاح" کے عنوان سے جو انجمن کے متعلق ان کے تاثرات پر مشتمل ہے اور دوسری "غزل گوئی پر ایک نظر" کے عنوان سے ہے جس کے متعلق مصنّف کا بیان ہے کہ یہ قیمتی مقالہ رشید احمد صدیقی نے ان سے لکھوا کر سہیل علی گڑھ میں شائع کرایا تھا۔ مضمون اعلی نثری ادب کا نمونہ اور لائق مطالعہ ہے۔

کم لوگوں کو معلوم ہے کہ محمد عبداللہ خاں خویشگی نے اقبال سہیل سے سوانحی تفصیل کی فرمائش کی تھی جو انہوں نے پوری کی۔ یہ مختصر مگر ایجاز و جامعیت کی مثال تحریر "علامہ اقبال سہیل کا خود نوشت تذکرہ" کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔ علامہ اقبال سہیل اور ادب اطفال والے مقالے میں "مطالعہ و آموختہ" کے نام سے سہیل صاحب کا قیمتی مقالہ ہے جو بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق بہت پہلے لکھا گیا تھا، عام استفادہ کے مقصد سے شامل کتاب ہے۔ اقبال سہیل

صاحب کی حقیقۃ الربا جمہور علماء وفقہاء کے مسلک کے خلاف قرار پائی اور اس سے ان کے ایک استاد نے بے زاری کا اظہار کیا تو ڈاکٹر صاحب کے بقول اس کے تمام نسخے خود مصنّف نے نذر آتش کر دیے لیکن بعد میں یہ کتاب ”ربا کیا ہے؟“ کے نام سے منظر عام پر آئی تو اس پر فاضل مصنّف کا الرشاد میں تبصرہ شائع ہوا۔ یہ تبصرہ بھی زینت کتاب ہے۔ آخر میں صاحب کتاب نے اپنے ادبی و شعری ذوق کے مطابق اقبال سہیل کے کلام کا انتخاب اس مقصد سے شامل کیا ہے کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا ایک مرقع سامنے آجائے۔

فاضل مصنّف کی شناخت ماہر شبلیات کی ہے اور اس میدان میں وہ ممتاز ہیں لیکن ادھر انھوں نے اعظم گڑھ کی بعض دوسری اہم اور فراموش شدہ علمی وادبی شخصیات کی جانب عنان توجہ موڑ دی ہے۔ یہ مفید کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی اور مطالعۂ اقبال سہیل میں اس لحاظ سے گراں قدر اضافہ ہے کہ اس سے سہیل شناسی کے بعض نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔ امید کہ اس کتاب سے سہیل شناسی کی طرف عہد حاضر کے محققین کا التفات واشتیاق مزید بڑھے گا۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ڈاکٹر شکیل احمد، گرم دم جستجو (خاکے)، صفحات ۲۲۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۲۵، قیمت: ۳۵۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۲۳۶۷۲۲۵۷۰۔

سمٹتا سائبان، بادل چھاؤں کے بعد اب مصنّف اپنے خاکوں کا یہ تیسرا مجموعہ لے کر حاضر ہیں۔ اس میں اٹھارہ مرحوم اور سات باحیات جن میں کچھ بزرگ، کچھ احباب اور کچھ معاصر شخصیات پر تعزیتی و تاثراتی تحریریں ہیں۔ مصنّف کے علمی وادبی تعلقات کا حلقہ وسیع ہے لیکن اس میں انہوں نے ایسے علماء و دادباء اور مصنّفین کو شامل کیا ہے جن کی حیات مستعار ان کے نزدیک ”گرم دم جستجو“ سے عبارت ہے۔ مرحومین میں مولانا اسیر ادروی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عزیز الحسن صدیقی، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، عبد الحی پیام انصاری، ڈاکٹر ایم، نسیم اعظمی اور مشہور شاعر آفاق فاخری وغیرہ اور زندوں میں پروفیسر احمد سجاد، پروفیسر عبد الحق، ڈاکٹر حیدر علی، ڈاکٹر شباب الدین اور مشتاق کریمی وغیرہ جیسے اہل علم وادب کے خاکے ہیں۔ ان اشخاص میں زیادہ تر کا تعلق درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے رہا ہے جن سے ایک زمانہ فیض یاب ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے۔ آخر میں مصنف نے اپنی چند مطبوعہ کتابوں پر اہل قلم کے مشہور جرائد میں شائع شدہ تبصرے بھی شامل کر دیے ہیں۔

ڈاکٹر شکیل احمد صاحب نے ان خاکوں میں اپنی پسندیدہ شخصیات کے ذاتی و اخلاقی اوصاف کے ساتھ ساتھ ان سے پہلی ملاقات، ان کی تعلیمی، علمی و ادبی سرگرمیوں اور ملی و قومی خدمات کا تذکرہ بھی دل کھول کر کیا ہے۔ حالات لکھنے میں تاریخ وسن کا اہتمام ان کے علمی و تحقیقی مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ خاکہ نگاری کے وقت منظر کشی کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ یہ خاکے مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، ان میں تدریجی وارتقائی کیفیت یعنی پہلے اور بعد کے لکھے گئے خاکوں میں قلم کی پختگی کے سفر کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ بیچ بیچ میں انہوں نے ادبی اور بڑے دلنشین جملے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد اصلاحی کے خاکے میں لکھتے ہیں: ”نام سے آفتاب تھے لیکن میرے لیے وہ ایسے آفتاب ثابت ہوئے جو کہیں بادلوں میں یا کسی اوٹ میں میری نظروں سے دہائیوں تک اوجھل رہے“۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کا سراپا اس طرح کھینچا ہے: ”قد اوسط، جسم قدرے گداز اور بھاری، آنکھیں روشن اور بڑی، آپ کی مسکراہٹ میں پیشانی، بھنویں، لب، رخسار یہاں تک کہ آنکھیں، ہونٹ سبھی شامل ہو جاتے“۔ ان کے خاکوں کی ایک خصوصیت جزرسی اور زیر نظر اشخاص کی خصوصی لیاقتوں کی جانب نشاندہی ہے۔ مصنف نے متعدد ادبی و علمی تصنیفات پر اپنے تاثرات بھی لکھے ہیں۔

خاکہ نگاری ادباء و مصنّفین کا محبوب فن ہے۔ اس غیر افسانوی صنف ادب میں کسی شخص کی ذاتی و فکری خوبیوں اور خامیوں کو دلچسپ زبان واسلوب میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی حقیقی تصویر سامنے آجائے۔ اس صنف میں مبالغہ آرائی یا مدح سرائی کا دخل نہیں ہوتا۔ جب اس اصول پر ان خاکوں کو پرکھا جاتا ہے تو اکثر خاکے فنی اور اصولی معیار پر کھرے اترتے اور اس فن سے صاحب کتاب کی اچھی واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ خاکے ان کے دوسرے خاکوں کی طرح دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ (ک۔ ص اصلاحی)

ڈاکٹر عرفات ظفر (مرتب)، شذرات اصلاحی، ناشر: حراء بک ڈپو، لکھنؤ، قیمت: ۵۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، صفحات: ۳۲۸، موبائل نمبر: ۷۰۰۷۸۹۲۰۰۵

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴ء-۱۹۹۷ء) کا شمار مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا شمار معروف اہل قلم اور ممتاز مفسرین میں ہوتا ہے۔ مولانا اصلاحیؒ نے مدرسۃ الاصلاح میں قیام کے دوران تدریس کے ساتھ قلم سے بھی مضبوط رشتہ قائم رکھا۔ چنانچہ

جب مدرسۃ الاصلاح کے ترجمان ماہنامہ "الاصلاح" کا اجرا ہوا تو مدیر کی حیثیت سے انہوں نے اس وقیع رسالے کی ادارت سنبھالی۔ یہ رسالہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا لیکن اپنے بلند پایہ مضامین اور اداریوں کے سبب اپنے وقت کے معیاری رسالوں میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ جب یہ رسالہ جنوری ۱۹۳۶ء میں جاری ہوا تو مولانا اصلاحی نے "الاصلاح کا ارادہ" کے عنوان سے شذرہ تحریر کیا اور اس میں اس رسالے کے مقاصد کو بیان کیا۔

دائرہ حمیدیہ کا قیام بھی اسی دوران ہوا۔ دائرہ حمیدیہ کے پیش نظر یہ اہم مقاصد تھے:

۱۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی عربی تصنیفات اور ان کے اردو ترجموں کی اشاعت۔

۲۔ ایک ماہانہ رسالہ جو قرآن مجید سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کرے، اور مسلمانوں کی مفید علمی و مذہبی خدمات انجام دے۔

۳۔ ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت جو کم سے کم قیمت میں اور سادہ اور آسان لفظوں میں قوم کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کر سکے۔

اخبار کے شائع ہونے کی نوبت نہ آسکی۔ اور دوسری جنگ عظیم میں چیزوں کی بے تحاشا گرانی پر مجبوراً اس رسالے کو بند کر دینا پڑا، اور اس کا آخری شمارہ نومبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

رسالہ الاصلاح میں شائع ہونے والے مولانا اصلاحیؒ کے یہ شذرات زبان و بیان اور علمیت کے لحاظ سے اپنی ایک شان رکھتے ہیں۔ اور ان کے شذرات کی اہمیت و معنویت آج بھی تازہ ہے۔ ان شذرات میں مدرسۃ الاصلاح اور دائرہ حمیدیہ کی مختصر نوع بنوع روداد کے ساتھ حالات حاضرہ پر تبصرے بھی ہیں، بعض نامور ان اسلام پر وفیات بھی ہیں۔ شذرات کے چند اہم عناوین درج ذیل ہیں:

مولانا فراہیؒ کی غیر مطبوعات، دائرۂ حمیدیہ، دائرہ کے پیش نظر مقاصد، الاصلاح کے مقاصد، دائرہ حمیدیہ کے معاونین، دائرۂ حمیدیہ کے نئے معاونین، الاصلاح کے مضامین، فتنۂ تکفیر، تکفیر سے رجوع، فتنۂ تکفیر کے بعد، مدرسہ کا کتب خانہ، مدرسہ کی مسجد، مدرسۃ الاصلاح کے وفود، علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں، سیرت شبلی، فاتحہ تفسیر نظام القرآن، معاصر جامعہ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ، ہماری وطنی زبان، قومیت اور وطنیت، ہندوستانی، قومی اور علمی حادثے، دو ادیبوں کی موت، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی مرحوم!، مولانا شوکت علی مرحوم!، شاعر اسلام علامہ اقبال مرحوم، اسلام اور اسلامی زندگی کے خصائص وغیرہ

ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۳۷ء میں مولانا اسلم جیراج پوری کی مولانا فراہیؒ کے تئیں بے خبری دیکھی تو ان کا اس انداز میں نوٹس لیا:

مولانا حمید الدین صاحب کے متعلق جو غلط فہمی مولانا اسلم صاحب کو ہے، اگر وہ چاہیں تو اس کو مولانا کی کتابیں مطالعہ کر کے رفع کر سکتے ہیں۔ بے خبرانہ کسی شخص کی نسبت ایسی بات لکھ دینا جس سے اس کی تحقیر اور اپنی برتری کا اظہار مقصود ہو تو نفس کو مرغوب ہے، لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے (ص ۱۱۷)۔

استدراک کے عنوان سے قرآن وحدیث میں جو مضبوط رشتہ ہے، اس کو یوں واضح کیا ہے:

ہمارا خیال ہے احادیث کی طرف سے عموماً لوگوں کو جو بدگمانی ہے، اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ لوگ قرآن مجید کے الفاظ پر خوب جم کر غور نہیں کرتے، اور اکثر جگہ اس کے لطیف اشارات سے دور رہ جاتے ہیں۔ اگر ان کے تتبع کی عادت پیدا کر لی جائے تو آہستہ آہستہ یہ بات محسوس ہونے لگے گی کہ حدیث اور قرآن میں کوئی بُعد و بیگانگی نہیں ہے۔ دونوں چیزیں بالکل متحد ہیں (ص ۱۲۷)۔

قومیت اور ملیت کے عنوان سے جو شذرہ لکھا ہے، وہ انتہائی سیاسی سوجھ بوجھ کا غماز ہے۔ اس میں جو اندیشہ کا امکان تھا، وہ واقع ہو کر رہا کہ قومیت اور ملیت میں افراط و تفریط اور ان میں باہم فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مولانا اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

مولانا رحمہ اللہ (مولانا آزادؒ) نے اس معاملے میں ٹھیک وسط و اعتدال کی راہ اختیار کی ہے، اور یہی "الاصلاح" کا بھی نقطۂ نظر ہے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ اور مشترک قومیت کے نقطۂ نظر سے ہمیں اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ وہ مختلف الاجزاء ہو اور ایسی صورتیں نظامِ حکومت میں اختیار کر لی جائیں جو مختلف اجزاء کے امتیازات و خصوصیات اور ان کے حقوق و اختیارات کا ٹھیک ٹھیک تحفظ کر دیں۔ اس کے بغیر خالص وطنی بنیاد پر قومیت کا تصور ہندوستان کی مختلف قوموں میں پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اس میں سر کھپانے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ کانگریس اگر اختلافات کی خلیج اور زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہتی تو اس کا فرض ہے کہ وہ معاملے پر اس نقطۂ نظر سے غور کرے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم نہ ہو جائے (ص ۲۶۸)۔

مجموعی لحاظ سے سارے شذرات لائق مطالعہ ہیں، اور ان کی اہمیت کے پیش نظر ان کا مجموعہ کافی تاخیر سے منظر عام پر آیا ہے لیکن یہ علمی دنیا کے لیے ایک قیمتی سوغات سے کم نہیں ہے۔ اس کے لائق مرتب مبارک باد و شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اہل علم کی رسائی اس مجموعہ کے ذریعے ہموار کر دی ہیں۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

سعدی شیرازیؒ کے مقبولِ انام قطعۂ نعتیہ کی منظوم اردو ترجمانی

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
نعمانی منزل، نزد ابوہریرہ مسجد۔ ہمدرد نگر۔بی، جمال پور، علی گڑھ

بَلَــغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ

بلندی آپؐ کی کیسے بیاں ہو لفظوں میں — جہاں کوئی بھی نہ پہنچا وہاں بھی پہنچے آپؐ
ہمارے بس میں نہیں آپؐ کے کمال کا وصف — کہ آگے ہفت سماوات کے گئے تھے آپؐ

کَشَفَ الدُّجَا بِجَمَالِہٖ

وجود آپؐ کا عالم میں ہے اک ایسا نور — شعاعیں جس کی ہیں رخشاں زمیں سے تا بہ فلک
جمالِ سرورِ عالمؐ سے سب ہوئے روشن — اندھیرے چھائے تھے دنیا کے جو کناروں تک

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ

خصائل آپؐ کی سب دلربا تھیں اور دلکش — حسیں تھے آپؐ کے اطوار اور سبھی افعال
تھیں ذاتِ پاک میں وہ سب ہی خوبیاں یکجا — کہیں نہیں ہے دوعالم میں جن کی کوئی مثال

صَلُّــوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

پڑھو، درود پڑھو، دائماً درود پڑھو — حبیب خالقِ کل رہنمائے عالمؐ پر
اور آلِ پاک اور اصحابِ باصفا پر بھی — پھر اُنؐ کی ساری ہی ازواج پر بھی شام و سحر

غزل

جمیل مانویؔ

حکمت دے جستجو دے زرِ اعتدال دے
جن سے مری شناخت ہو وہ خط و خال دے
یا میرے دل کو نور کے سانچے میں ڈھال دے
یا دل سے خواہشات کے کانٹے نکال دے
اپنے ہنر کو خیر کے سانچے میں ڈھال دے
دنیا مثال دے تو وہ تیری مثال دے
جلووں سے بام و در بھی ہیں روشن ، نگاہ بھی
دل کے اندھیرے دور ہوں ایسا جمال دے
اس راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں بھی ہیں
یہ راکھ بے ضمیروں کے چہروں پہ ڈال دے
دنیا گناہ کرکے چھپاتی ہے جس طرح
تو اپنی نیکیوں کو سمندر میں ڈال دے
پچھلے تنازعات پہ آ خاک ڈال دیں
ممکن ہے پھر خدا کوئی رستہ نکال دے
چاہے تو حسنِ یار تصرف عطا کرے
چاہے تو اک تبسم پنہاں پہ ٹال دے
شاید کہ اس سے غنچۂ امید کھل اٹھے
دو بول پیار کے مری جھولی میں ڈال دے
روشن ہیں آج ، بجھ گئے کل اس سے فائدہ
جس کو کبھی زوال نہ ہو وہ کمال دے
پھر بحر و بر پہ راج اندھیروں کا ہے جمیلؔ
ایسا چراغ لا ، کہ جو دنیا اجال دے

معارف کی ڈاک

محب مکرّم کلیم صفات اصلاحی صاحب! آداب۔

آپ نے "معارف" فروری ۲۰۲۶ء کا شمارہ واٹس ایپ کے ذریعے بھیجا، جس میں "گیان چند جین کے خطوط مشاہیر ادب کے نام" کی تینوں جلدوں پر آپ کا تبصرہ شامل ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میری دونوں آنکھوں کا آپریشن ہو چکا ہے اور میں نظر کے چشمے کے بغیر پڑھ نہیں سکتا اور خاص کر موبائل پر ٹائپ ہوئی چیز۔ میری دوسری بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں موبائل پر اپنا نام بھی ٹائپ نہیں کر سکتا۔ بڑی مشکل سے انگریزی یا رومن میں ایک دو جملے لکھ پاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کل میں نے واٹس ایپ پر لکھا تھا کہ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اس کے علاوہ میں کچھ اور نہیں لکھ سکتا۔"

کل رات بازار جا کر میں تبصرے کے زیر اکس نکلوا لایا اور انھیں پڑھ ڈالا۔ بھائی صاحب! آپ نے جس باریک بینی سے جین صاحب کے خطوط کی تینوں جلدوں کا مطالعہ کیا ہے، یہ آپ ہی کے حصے کی چیز ہے۔ آج کے مادّی دور میں کس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ وہ اتنی گہرائی سے مطالعہ کرے، نوٹ تیار کرے اور تفصیل سے تبصرہ لکھے۔ آپ نے آنے والی ادبی نسل کے لیے جو آسانی مہیا کر دی ہے یہ میری نظر سے پہلی بار گزری ہے۔

میرے پاس غالب، سرسید، شبلی، اقبال، مالک رام، رشید حسن خان صاحب کے خطوط کے علاوہ مشاہیر کے خطوط بہ نام ڈاکٹر ابو محمد سحر، گوپی چند نارنگ اور "نقوش لاہور" کے خطوط نمبر کی چاروں جلدیں موجود ہیں۔

بعض رسائل میں بعض حضرات کے خطوط سے متعلق بعض حضرات کے تبصرے میری نظر سے گذرے ہیں۔ ہر شخص کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ آپ نے جین صاحب کے خطوط سے جس طرح جین صاحب کی شخصیت کو باہر نکال کر صفحۂ قرطاس پر پیش کر دیا ہے، جو شخص بھی اس تبصرے کو پڑھے گا وہ جین صاحب کے خطوط پڑھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

میرے نزدیک کسی ادبی شخصیت کی سوانح مرتب کرنے کے لیے اس کے خطوط واحد مستند دستاویز ہو سکتے ہیں۔ آپ نے جین صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو پر ان کی مدد سے تفصیل سے

روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے تبصرے میں جین صاحب کی تصنیف ”ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب“ پر بھی اچھی گرفت کی ہے۔ زبان و ادب سے متعلق ہر شخص کو حق واختلاف سے بات رکھنے کا حق ہے۔

اس کتاب کا جو باب اختلافات کا باعث ثابت ہوا، اس کے تحریری انداز اور باقی ابواب میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ میں نے گذشتہ برس ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی کے انچارج صاحب سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ آپ قلمی مسوّدہ مجھے زیراکس کی صورت میں یا اصل صورت میں دے دیجئے، میں جو دام آپ چاہیں گے دے دوں گا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ نارنگ صاحب نے ہمیں کمپوز شدہ مسوّدہ دیا تھا۔ اب اصل مسوّدہ کہاں ہے کسی کو نہیں پتا، وہ اگر مل جاتا تو کسی حد تک بات صاف ہو سکتی تھی۔ جین صاحب نے اس کتاب کی اشاعت کی تمام تر ذمہ داری نارنگ صاحب کو سونپ دی تھی۔ وہ جسمانی طور پر معذور ہو چکے تھے۔

بھائی صاحب! جین صاحب کے خطوط کی تین جلدوں کے سیٹ قریب پچاس ادبی شخصیات کو بھیج چکا ہوں۔ بہتوں نے تو واٹس ایپ پر رسید تک نہیں بھیجی۔ بعض رسائل کے مدیران کو بھی کتابیں بھیجی ہیں۔

آپ نے تفصیل سے تبصرہ لکھ کر جو میری حوصلہ افزائی کی ہے، میں تاعمر یاد رکھوں گا۔ اب جین صاحب کے خطوط کی اور جلد مرتب نہیں کر پاؤں گا۔ ہاں مشاہیر ادب کے خطوط کی جلد اول بہ عنوان ”مشاہیر کے خطوط بنام پروفیسر گیان چند جین“ شائع ہو چکی ہے۔ اگر خدا نے چاہا کسی ایک جلد کے آخری ضمیمے کی صورت میں اس تبصرے کو شامل کروں گا۔

گذشتہ رات ”رشید حسن خاں کے خطوط“ جلد چہارم کا کمپوز شدہ مسوّدہ آخری بار نظر ثانی کے لیے آیا ہے۔ اس میں خاں صاحب کے قریب ۲۱۹ خطوط شامل ہیں اور یہ کوئی ۴۱۵ صفحات کو محیط ہو گا۔ آج ہی اس کے پرنٹ نکلواتا ہوں۔ امید ہے اس ماہ یہ مجموعہ شائع ہو جائے گا اور آپ تک پہنچے گا۔

مجھے کامل یقین ہے کہ آیندہ بھی آپ کا کرم اسی طرح میرے حال میں شامل رہے گا۔ خدا کرے آپ مع متعلقین بہ عافیت ہوں گے۔

خیر اندیش ٹی-آر-رینا

الف ۲۳/۷، لوئر ہری سنگھ، رہاڑی کالونی، جموّں ۱۸۰۰۰۵

رسید کتب موصولہ

مفتی سید عبد الفتاح، مفتی فاروق خان مصباحی (تحقیق و تخریج)، جامع الفتاویٰ (جلد اول): مولانا مظہر حسین علیمی، ممبئی، صفحات: ۶۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۷۰۲۱۳۳۳۳۷۵

ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی، حسن قرأت و علم تجوید کے بنیادی اصول: ڈاکٹر ندیم احمد آراضی باغ، اعظم گڑھ، صفحات: ۱۶۵، سالِ اشاعت: درج نہیں، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۳۰۳۳۸۷۷۵۴

عبد القادر چوگلے، سید ابو الحسن علی ندوی لائف اینڈ لیگیسی (انگریزی): اسلامک ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، ندوہ کیمپس، ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صفحات: ۳۳۹، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، فون نمبر: ۰۵۲۲-۲۷۴۱۵۳۹

عرفان اعظمی، صبح کا آنچل: سالم بک ڈپو، یک مینارہ مسجد، تکیہ، اعظم گڑھ، صفحات: ۲۹۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

مضطر اعظمی، فصیل شہر: مکتبہ اسلامیہ، بلریا گنج، اعظم گڑھ، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

باب العلوم (پیش کش)، قاری محمد اسماعیل ظفرؒ: حیات و خدمات: باب پبلی کیشنز، ڈاکٹر سریش سرکار روڈ، مولا علی، کلکتہ، صفحات: ۲۰۸، سالِ اشاعت: درج نہیں، قیمت و موبائل نمبر: درج نہیں

مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری (مرتب)، محدثین کا طریقۂ کار (اپنی تصنیفات کے آئینے میں): جمعیۃ المعارف الاسلامیہ، ٹیگور مارگ، دار العلوم ندوہ العلماء، لکھنؤ، صفحات: ۲۰۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۸۴۷۷۸۸۰۰

محمود عالم، معراج المؤمنات: عثمانیہ بک ڈپو، رابندر سرانی، کولکاتا، صفحات: ۱۸۶، سالِ اشاعت: ۲۰۱۳ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۹۳۱۷۹۱۷۷۳

سہیل انجم، مولانا ابو الکلام آزاد: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی، صفحات: ۱۳۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۱۶۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۱۵۱۷۷۳۹۹

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، نقوش اعظم گڑھ: پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات: ۳۹۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰن ؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

MAR 2026 Vol- 213(3) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 # MA'ARIF **AZM/NP- 43/2026-28**

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپئے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay Paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (ڈائرکٹر)